بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

ولا یأتونک بمثل الا جئنٰک بالحق واحسن تفسیرا

کتاب التفسیر

موسوم بہ

تفسیر جلالی



از
حکیم محمد جلال الدین حسامی
بی۔ اے (آنرز) منشی فاضل و مولوی فاضل

حیدر آباد دکن کا کثیر الاشاعت دینی و علمی ماہنامہ

حسامی

مدیر مسئول :- مولوی سید اسمٰعیل صاحب حسامی قادری ام اے ڈی ال ایس سی کلکتہ

زیر نگرانی :- محمد حمید الدین حسامی عاقل ام اے ۔ ریسرچ اسکالر (عثمانیہ یونیورسٹی) مولوی و منشی فاضل (حافظ)

حامیِ دینِ متین شیدائے ختم المرسلین السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ اس زمانے میں جبکہ دین وایمان کے خزانوں پر ہر سمت سے ڈاکے پڑرہے ہیں اور احکامِ اسلام سے ناواقفیت عام ہوتی جارہی ہے کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کو مسلمانوں نے پس پشت ڈال دیا ہے اور صحابۂ کرام و اولیائے عظام کی محبت افراط و تفریط کا شکار ہوتی جارہی ہے ہم نے ماہ اکتوبر ۱۹۵۶ء م ماہ ربیع المنور ۱۳۷۶ھ کے مبارک مہینے اس دینی وعلمی ماہنامہ کو جاری کیا جو ماہ بماہ بہ پابندی شائع ہورہا ہے ۔ جسکی اجرائی کا اولین مقصد مسلمانوں کو احکام الٰہی وسنتِ نبوی سے واقف کرانا اور اس پر عمل کرنے کی موثر انداز میں ترغیب دینا ، بزرگانِ دین کے صحیح حالات سے روشناس کرانا ، توہم پرستی ضعیف الاعتقادی اور احساسِ پستی کو دفع کرنا ہے تاکہ مسلمان سچے اور باعمل مسلمان بنیں ۔

اس رسالے کی ظاہری خوبصورتی اور مضامین کی دلکشی نے اس قلیل عرصہ میں ہزاروں کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے ۔ معاصر رسائل و اخبارات نے بھی بیرے لاگ تبصرے کرتے ہوئے اپنے زرین خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ مثلاً ہندوستان کا مقبول خاص و عام و موقر روزنامہ رہنمائے دکن لکھتا ہے :

"ماہنامہ حسامی حیدر آباد کا دینی وعلمی وادبی رسالہ ہے جو بڑی آب وتاب سے شائع ہورہا ہے ، ابتک اس کے آٹھ نو پرچے نکل چکے ہیں جس میں سے چند خصوصی نمبر کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ مضامین دلچسپ اور معیاری ہوتے ہیں جو نظم و نثر پر مشتمل ہوتے ہیں فقہی مسائل ، تفسیر قرآن ، بزرگان سلف کے تذکرے تاریخی و مذہبی مضامین ہوتے ہیں جو بہت ہی معلومات افزا اور ایمان افروز ہوتے ہیں ۔ کتابت وطباعت بہت ہی اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے حیدر آباد سے **ایسا مذہبی و معیاری مجلہ ابتک شائع نہیں ہوا تھا جس کا ہر نمبر "بہتر از اول" کا مصداق** ہے ۔ رسالے کے فاضل مدیر مولوی محمد حمید الدین صاحب حسامی عاقل ام اے ہیں جو جامعہ عثمانیہ کے فارغ اور علومِ اسلامیہ میں درک رکھتے ہیں ۔" (رہنمائے دکن ۳ رجون ۱۹۵۷ء دوشنبہ) ۔

غرض آپ خود جب اسکا مطالعہ فرمائیں گے تو اسکے محاسن اور ان خوبیوں کو دیکھکر جو اسکو دیگر رسائل سے ممتاز کرتی ہیں آپ کو اس کی خریداری پر مجبور پائیں گے ۔

ہمیں آپکی ذات گرامی اور اخلاق کریمانہ سے قوی امید ہے کہ (۱) آپ اسکے مستقل خریدار بنکر (۲) ایجنٹ حضرات ایجنسی قبول فرماکر (۳) تاجر و صناع حضرات اپنی مصنوعات وتجارت کا اشتہار دیکر ماہنامہ حسامی کی سرپرستی قبول فرمائینگے اور ایک مذہبی رسالے کو فروغ دیکر عنداللہ ماجور ہونگے اور اس فتنوں کے دور میں اسلام کے ایک سچے خادم ومبلغ کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے ۔

سائز رائل ۸/۱ صفحات (۸۰) ٹائٹیل آرٹ پیپر مختلف رنگوں سے مزین ہر ماہ نیا بلاک ۔ فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے ۔ سالانہ صرف (عہ) روپے ۔ وی پی خرچ بذمہ خریدار ۔ دیگر تفصیلات حسب ذیل پتہ پر

مینیجر ماہنامہ حسامی حسامیہ منزل پنجہ شاہ حیدر آباد دکن ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بلغت المراد و نلت الغنا　　　　لک الحمد و الشکر یا ربنا

کتاب التفسیر

دیباچہ

حمد اللہ والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ط

یہ تفسیر جدید اس متکلم قدیم کے کلام قدیم کی ہے جس نے حکمت و فصاحت کو پیدا کیا اس کا یہ کلام جس طرح مشتمل آیات ہے اسی طرح فصاحت و بلاغت میں بے نظیر ہے ۔ اور جس طرح دین محمدی قیامت تک رہیگا اسی طرح یہ کلام الٰہی بھی معجزہ محمدی کے طور پر باقی ہے اور رہیگا ۔ اس دین میں جس طرح تبدیلی و تنسیخ نہیں اسی طرح اس کتاب میں تحریف ناممکن ۔

حق تعالیٰ نے وَلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ کے مصداق ہر قوم کیلئے رہنما بھیجے ۔ اور ہر رسول مبعوث کو ایسا معجزہ عطا فرمایا جو انکے زمانہ والوں کو عاجز کر دینے والا ہوتا تھا چنانچہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السلام کے زمانہ میں ہر طرف جادو کا بہت شہرہ تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے آپکو ایسا معجزہ عطا فرمایا جو آپکے زمانہ کے مایہ ناز جادوگروں کو عاجز کر دے چنانچہ آپ کا عصا اژدہا بن جاتا اور آپکو ید بیضا بھی بطور معجزہ عطا ہوا ۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو اس زمانہ میں علم طب بام عروج پر تھا اسلئے حق تعالیٰ نے آپکو ایسے معجزات دیکر پیغمبر بنایا جو آپکے ہم عصر اطباء کو عاجز کر دیں چنانچہ آپ کوڑھی جذامی کو اچھا کر دیتے اور مادر زاد اندھے کو بینا بنا دیتے مردے کو زندہ فرماتے تاکہ اہل زمانہ آپ پر ایمان لائیں ۔ اسی طرح جب ہمارے پیغمبر سید المرسلین خاتم النبیین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا بہت چرچا تھا ۔ ایک سے بڑھکر ایک فصیح تھا ۔ انکی فصاحت پر عرب کو اس قدر ناز تھا کہ وہ اپنے سوا سب کو عجم[1] یعنی گونگے کہتے تھے ۔ اسلئے اللہ تعالے نے آپکو دیگر معجزات کے علاوہ قرآن مجید کا ایک ایسا معجزہ بھی عطا فرمایا جسکی فصاحت و بلاغت کے مقابلہ میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا ۔ چنانچہ خود قرآن مجید نے سب کو چیلنج دیا ہے کہ

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ یعنی اگر تم کچھ شک میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل کی ہے اپنے خاص بندہ پر تو اچھا پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کلام جیسا ہو اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو جو خدا کے

---

[1] بہائم کو بھی عجمی کہتے ہیں گویا اہل عرب صرف اپنے کو ہی ناطق یعنی گویا کہنے والا کہتے باقی غیر عرب کو بے زبان یا گونگے کہتے اسلئے غیر عرب جتنے ہیں انکے لئے عجمی لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ (لغات القرآن)

الگ (تجویز کر رکھے) ہیں اگر تم سچے ہو (پ ۱ ر ۳) لیکن قرآن مجید نازل ہوکر آج چودہ سو برس ہو رہے ہیں مگر کسی نے ایک جملہ بھی کلامِ الٰہی جیسا نہ بنایا اور نہ آئندہ کوئی بنا سکتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایسا زندہ معجزہ ہے جو اپنے اعجاز کا ہر زمانہ میں چیلنج دے رہا ہے۔

مشرکینِ مکہ میں سے بڑے بڑے فصیح و بلیغ آدمیوں نے قرآن مجید میں سے تین لفظوں کو چن کر غیر فصیح قرار دیا۔ جسکے بعد اپنی دانست میں بہت خوش ہوگئے اور وہ تین لفظ یہ تھے (۱) ھُزُواً (۲) کُبَّار (۳) عُجَاب۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مشرکینِ مکہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ "آپ تو قرآن کو بہت فصیح بتلاتے ہیں مگر یہ تین الفاظ اسمیں غیر فصیح ہیں" (اگرچہ یہ ان کا اعتراض غلط تھا مگر پھر بھی) آپ نے ان معترضین کے گروہ سے فرمایا کہ "تم کسی ایسے شخص کو منتخب کرو جسکی فصاحت و بلاغت کو تم تسلیم کرتے ہو اور اس کی زبان سے کبھی غیر فصیح کلمہ نہ نکلا ہو تاکہ میں اس سے اس معاملہ میں گفتگو کروں ورنہ میں تم میں سے کس کس کو جواب دوں گا"

معترضین نے اس ارشاد کو تسلیم کیا اور کچھ دیر کے بعد ایک بہت فرتوت بوڑھے کو لائے اور کہنے لگے کہ "یہ بوڑھا بڑا فصیح و بلیغ ہے کبھی اپنی زبان سے اس نے غیر فصیح لفظ نہیں نکالا ہے" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بوڑھے کو فرمایا "بیٹھ جاؤ" وہ بیٹھ گیا۔ پھر آپ نے فرمایا "اٹھو" تو وہ بوڑھا کھڑا ہوگیا۔ آپ نے اسے پھر فرمایا کہ "بیٹھ جاؤ" وہ بیٹھ گیا۔ پھر اٹھ کھڑے ہونے فرمایا وہ کھڑا ہوگیا اسی طرح چند بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرتوت بوڑھے کو اٹھایا اور بٹھایا جسکی وجہ وہ تھک

تھک گیا اور چڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوکر کہنے لگا "اِنَا شَیْخٌ کُبَّارٌ اَتَتَّخِذُنِیْ ھُزُواً ھٰذَا شَیْءٌ عُجَابٌ" یعنی میں بہت بوڑھا ہوں کیا آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں (اور آپ کا ایسا مذاق کرنا) بڑے تعجب کی بات ہے"

جائے حیرت ہے کہ اس بوڑھے فصیح نے اپنے ایک جملہ میں ان تینوں الفاظ کو استعمال کیا جن کو مشرکینِ مکہ نے غیر فصیح قرار دیا تھا۔ یہ سننے کے بعد معترض مشرکین اپنے اعتراض پر نادم ہوئے اور بعض تو قرآن مجید کی فصاحت کے قائل ہوگئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اعتراض کا جواب ان ہی کے مسلّمہ فصیح و بلیغ کی زبان سے دلوا دیا۔

ہر پیغمبر کا معجزہ صرف انکی زندگی تک رہا۔ جب وہ چل بسے تو انکا معجزہ بھی دنیا میں باقی نہ رہا۔ مگر یہ قرآن مجید حضرت خاتم النبیین کا ایسا معجزہ ہے جو آپکی وفات کے بعد مفقود نہیں ہوا بلکہ اپنے اسی اعجاز کیساتھ باقی ہے اور رہے گا۔ اسکی حفاظت کا ذمہ خود حق تعالیٰ نے لیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (پ ۱۴ ر ۱) یعنی ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اسکے محافظ (اور نگہبان) ہیں) اور جس زبان میں یہ کلام اللہ نازل ہوا ہے یعنی زبانِ عربی وہ دنیا کی تمام زبانوں میں اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بہت ممتاز ہے کیونکہ یہ دیگر زبانوں کی طرح کسی دوسری زبان کے سہارے پر قائم نہیں ہے اور صوتیاتی لحاظ سے نہایت ترنم ریز اور اپنے اندر خاص جاذبیت رکھتی ہے۔ اور اسی زبان میں کلامِ الٰہی نازل ہونے سے اس کی خوبی میں اور اضافہ ہوگیا ہے چنانچہ زبانِ عربی سے ناواقف شخص کے سامنے بھی قرآن مجید

کی آیات تلاوت کیجاتی ہیں تو سننے والے پر معنی نہ سمجھنے کے باوجود رقت طاری ہوجاتی ہے۔

سوال (۱) خدا تعالیٰ کا یہ آخری پیغام زبان عربی میں کیوں نازل ہوا؟ **جواب:-** اسلئے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملک عرب میں بمقام مکہ پیدا ہوئے جہاں عربی زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

ذات پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبان عربی

سوال (۲) شہر مکہ معظمہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہونے میں کیا مصلحت ہوگی؟ **جواب:-** چونکہ آپ نبی آخر الزماں تھے اور تمام اقوام عالم کے لئے رسول بناکر مبعوث فرمائے گئے تھے۔ اس لئے آپ کا مقام پیدائش بھی مرکزی حیثیت والا ہونا ضروری تھا جیسا کہ کسی مملکت کا صدر مقام بلحاظ مرکزیت منتخب کیا جاتا ہے اسی طرح مکہ معظمہ ہی ربع مسکون کا مرکزی مقام ہے جیسا کہ دنیا کے نقشہ سے ظاہر ہے لہذا آنحضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اسی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ علاوہ ازیں چونکہ دنیا کے تمام شہروں میں آپ کا دین پھیلنے والا تھا اسلئے مکہ معظمہ جسے ام القریٰ یعنی بستیوں کی ماں کہا جاتا ہے آپ کا مقام پیدائش ہوا۔

ایک عرصے سے ایسی اردو تفسیر لکھنے کا خیال تھا جو مستند تفاسیر کا لُبِّ لُباب ہو۔ اور عام فہم انداز میں رموز ومطالب قرآنی کو سوالاً جواباً بیان کیا جائے تاکہ ناظرین کرام کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہو۔ لفظی معنی کے علاوہ آیات کے مجموعی معنی اس نہج پر لکھے جائیں کہ جسے پڑھ کر عربی سے ناواقف شخص بھی آگے چل کر از خود اکثر جملوں کا ترجمہ کرسکے۔ توفیق الٰہی رفیق ہوئی۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید۔ بحمد اللہ میں نے تفسیر کا سلسلہ شروع کردیا ہے

بپوش اگر بخطائے رسی و طعنہ مزن
کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود

مجیب الدعوات سے دعا ہے کہ یہ تفسیر مکمل ہو اور اسے عوام وخواص میں مقبولیت حاصل ہو اور میرے لئے سعادت دارین کا باعث بنے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ

ماخوذات تفسیر فاضل تفسیر کبیر تفسیر ابن کثیر تفسیر حقانی وغیرہ

خادم قوم **حکیم محمد جلال الدین حسامی** عفی عنہ

طبیب منشی فاضل و مولوی فاضل طبیب سرکاری

(حیدرآباد دکن)

قرآنِ پاک

(نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل رحمۃ اللہ علیہ)

درد مندوں کی دوا قرآنِ پاک
گمرہوں کا رہنما قرآن پاک

مومنوں کی ہے حیات جاوداں
قدسیوں کی ہے غذا قرآن پاک

قلب مومن کا سکون لازوال
چشم حق بیں کی ضیا قرآن پاک

زندگی انسان کی ہے اک آئینہ
اور اس کی ہے جلا قرآن پاک

رحمت اُن پر جو سمجھ کر اے جلیل
پڑھتے ہیں صبح و مسا قرآنِ پاک

حامداً ومصلیاً ومسلماً

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

تفسیر

اگرچہ بسم اللہ ہی سے قرآن مجید کی ابتدا ہے۔ لیکن تلاوت سے پہلے چونکہ تعوذ کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ہ (یعنی جب قرآن پڑھو تو راندے ہوئے شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کرو۔) اس لیے میں نے اس تفسیر قرآن کو بھی تعوذ سے شروع کیا ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

اَعُوْذُ۔ میں پناہ لیتا ہوں۔ ب۔ ساتھ۔ اللہ۔ خدا تعالیٰ کا خاص نام۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کے معنی ہوئے "میں اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتا ہوں"۔ مِنَ۔ سے۔ شَیْطٰن۔ ابلیس کا نام۔ رَجِیْم۔ دھتکارا ہوا۔ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کے معنی ہوئے۔ دھتکارے ہوئے شیطان سے۔

ترجمہ:۔ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتا ہوں دھتکارے شیطان سے۔

سوال (۳) اللہ کس زبان کا لفظ ہے؟ **جواب** یہ سریانی ہے۔ اصل میں لَاھَا تھا جس کے آخر کے لفظ الف کو حذف کر کے شروع میں الف لام داخل کر کے معرب (زبان عربی کا لفظ) بنا لیا گیا اللہ ہوا۔

سوال (۴) یہ الف لام لفظ اللہ میں اصلی ہونے کا کیا ثبوت؟ **جواب:۔** عربی قواعد کے لحاظ سے حرف ایسے اسم پر داخل نہیں ہو سکتا جس کا جز الف لام ہو۔ چنانچہ یا الرحیم اسلئے نہیں کہہ سکتے کہ یہ الف لام لفظ رحیم کا جز نہیں ہے۔ مگر اللہ کے الف لام سے پہلے حرف ندا یعنی "یا" لگا کر یا اللہ کہا جاتا ہے اسلئے معلوم ہوا کہ لفظ اللہ میں الف لام اصلی ہے اور اس کا جز ہے۔

سوال (۵) تعوذ میں دیگر اسمائے الٰہی کو چھوڑ کر صرف اللہ ہی کا نام خصوصیت کیساتھ لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب:۔ دشمن جب کہ سخت دشمن ہوتا ہے تو اس کو دفع کرنے کے لیے بڑی طاقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ چونکہ لفظ اللہ، الوہیت کی تمام صفات کمال کا جامع ہے اسلئے ایسے ہی نام کی پناہ شیطان جیسے عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ کے شر سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

سوال (۶) تمام فرشتوں وغیرہ کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ مانگنے میں کیا حکمت ہے جبکہ چھوٹے سے چھوٹے فرشتے کی پناہ مانگنے سے بھی شیطان کی برائی سے بچاؤ حاصل ہو سکتا تھا چنانچہ حفاظت کرنیوالے فرشتے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَیُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَفَظَۃً (پ ۷ س ۱۴) (یعنی تم پر حفاظت کرنیوالے فرشتے بھیجتا ہے) اور جب ایسا ہو سکتا تھا تو ایک ایسے ذلیل اور بے وقعت کی برائی سے خدا تعالیٰ جیسے جلیل القدر اور باعظمت بادشاہ سے پناہ مانگنا کیونکر مناسب ہو سکتا ہے؟ **جواب:۔**

اللہ تعالیٰ نے تعوذ میں اپنا نام شامل فرما کر جیسا کہ ارشاد ہے
فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ من
الشیطٰن الرجیم ۔ میں اس طرف لطیف اشارہ
فرمادیا کہ اے بندے میں نے تیری حفاظت اپنے غیر
کے حوالہ نہیں کی بلکہ میں خود تیرا محافظ ہوں ۔

علاوہ ازیں شیطان کی دشمنی کافروں کی عداوت
سے بہت مختلف ہے اس لئے کہ جو مسلمان کافروں کے
ہاتھ سے مارا جاتا ہے وہ شہید ہوتا ہے لیکن جو شیطان
کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے وہ مردود ہو جاتا ہے ۔ اور
اور کفار جس پر غالب آجائیں وہ اجر پاتا ہے لیکن شیطان
جس پر غالب آجائے وہ برباد ہو جاتا ہے ۔ شیطان انسان
کو دیکھتا ہے مگر انسان شیطان کو نہیں دیکھ سکتا ۔
اس لئے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ تم شیطان سے
فرشتوں کی پناہ طلب نہ کرو کیونکہ جس طرح فرشتے شیطان
کو دیکھتے ہیں اسی طرح شیطان بھی فرشتوں کو دیکھتا ہے
بلکہ تم شیطان کے شر سے اس خدائے قدوس کی پناہ
چاہو جسے شیطان نہیں دیکھ سکتا کیونکہ جس طرح انسان
کو نظر نہ آنیوالا شیطان بہکاتا ہے اسی طرح اس شیطان
کے شر سے وہی اللہ تعالیٰ بچا سکتا ہے جسے شیطان نہیں
دیکھ سکتا ۔

سوال ۷) حق تبارک تعالیٰ کو اللہ کہتے ہیں
معنوی کیا مناسبت ہے ؟ **جواب :۔** جو لوگ لفظ اللہ
مشتق[لہ] ہونا مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ اصل میں الالٰہ تھا ۔
جسکے معنی معبود کے ہیں اور ہر جھوٹے سچے معبود کیلئے کہا جاتا
ہے لیکن اللہ معبود برحق ہی کے لئے مختص ہو گیا ۔ یا یہ کہ
اللہ "اَلِہَ" سے مشتق ہے جس کے معنی "متحیر ہوا" کے
ہیں چونکہ انسانی عقلیں بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت میں حیران
ہیں اس لئے اس کو الٰہ کہتے ہیں ۔ یا یہ کہ اللہ "اَلِہَ"
جسکے معنی مصیبت سے گھبرا گیا اور "اَلَہَہٗ" (یعنی اس
نے اس کو پناہ دی) سے مشتق ہے کیونکہ پناہ مانگنے
والا معبود ہی کی طرف دوڑتا ہے یا اس کو اللہ تعالیٰ پناہ
دیتا ہے یا یہ کہ لفظ اللہ "اَلِہَ" (یعنی سکون حاصل کیا)
سے بنا ہے کیونکہ دل خدا تعالیٰ کے ذکر سے اور روحیں
اسکی معرفت سے سکون حاصل کرتی ہیں ۔ یا "اَلِہَ" سے
مشتق ہے جسکے معنی چمٹ گیا بیقرار ہوا کے ہیں ۔ اور بندے
بھی مصائب کیوقت حق تعالیٰ کی طرف ہی تضرع وزاری
کرتے ہیں اور اسی کے آستانے سے لپٹے ہوئے رہتے
ہیں ۔ یا "وَلَہٌ" (عقل کا چلا جانا یا انتہا محبت کرنا)
سے لفظ اللہ مشتق ہے کیونکہ بندے حق تعالیٰ سے
بے انتہا محبت رکھتے ہیں اور عقل انسانی صفات الٰہی
کی تحقیق میں حیران ہو جاتی ہے ۔ یا یہ کہ لفظ اللہ "لَاہَ"
سے ماخوذ ہے جسکے معنی چھپنا ۔ بلند ہونا ہیں ۔ اللہ تعالیٰ
بھی نظروں سے پوشیدہ اور ہر چیز سے بالاتر اور پاک
ہے لہذا باری تعالیٰ کو اللہ کہنے لگے ۔ یا لفظ اللہ
اصل میں صرف حرف (ھ) تھا جو بعید کے لئے اسم
اشارہ ہے ۔ پھر لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنی عقول کی
نظروں میں موجود تصور کیا اسلئے ابتداء میں اس کو صرف
کنایہ سے اسکی طرف اشارہ کیا پھر اس ھ پر لام

لہ معنی اور ترکیب میں اگر ایک لفظ دوسرے کا شریک ہو تو
اس شرکت کا نام اشتقاق ہے ۱۲

ملک اضافہ کیا (کیونکہ سب کا مالک وہی اللہ تعالیٰ ہے)
تو لہٗ ہوا پھر الف لام تعظیماً زیادہ کیا تو لفظ اللہ ہوگیا۔
سوال (۸) اور جو لوگ لفظ اللہ کو اسم علم کہتے
ہیں اور مشتق نہیں مانتے ان کے کیا دلائل ہیں اور قول
فیصل کیا ہے **جواب**۔ (۱) اس لفظ اللہ میں وصفیت
کے معنی نہیں ہیں اس لئے یہ بطور صفت کے کبھی استعمال
نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ موصوف ہی ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید
میں ہے هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْمَلِكُ
الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ
الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُؕ (یعنی اللہ وہی ہے جس کے سوا اور
کوئی معبود نہیں وہ بادشاہ ہے پاک ہے سالم ہے امن
دینے والا ہے نگہبانی کرنے والا ہے زبردست ہے
خرابی کا درست کرنے والا ہے بڑی عظمت والا ہے)
اس آیۃ میں اللہ موصوف ہے باقی نام اس کی صفت
واقع ہوئے ہیں۔ (۲) لفظ اللہ ذات باری تعالیٰ
پر دلالت کرتا ہے اور اس کے سوا کسی دوسرے کیلئے
یہ لفظ استعمال ہی نہیں ہوتا بخلاف دوسرے اسمائے
الٰہی کے چنانچہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے سے کافر اسلام میں
داخل ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے توحید خداوندی کا مفہوم
نکلتا ہے اور بجائے لفظ اللہ کے مثلاً لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الرَّحِیْمُ
کوئی کافر کہے تو چونکہ لفظ رحیم غیر خدا کے لئے بھی استعمال ہوا
کرتا ہے اس لئے اس سے خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا
اقرار سمجھ میں نہیں آتا لہٰذا وہ مسلمان نہیں ہو سکتا پس معلوم
ہوا کہ لفظ اللہ اسم عَلَم ہے مشتق نہیں ہے۔
قول فیصل۔ لفظ اللہ اصل میں تو وصف ہے،
جسکے معنی معبود کے ہیں اور لفظ اللہ کی جو اصلیں
درج کیگئی ہیں وہ اس کے مشتق ہونے پر دلالت کی جاتی ہیں
پس یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ بھی وصفی نام ہے مگر ذات
باری تعالیٰ کے لئے بکثرت استعمال ہونے اور کسی غیر کے لئے بالکل
استعمال نہونے کی وجہ ذات باری عزاسمہ کیلئے اللہ اسم علم کی
طرح ہوگیا اور اسی سے صفات کا تعلق ہوتا ہے خود بطور صفت
مستعمل نہیں ہوتا چنانچہ ایسا کہا جاتا ہے کہ سلام وغیرہ
اللہ کے نام ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ اور سلام قدوس
کے نام ہیں۔
سوال (۹) شیطان کی وجہ تسمیہ اور اس کو رجیم
کہنے کی کیا وجہ ہے؟ **جواب**۔ یہ لفظ شَطَن سے بنا ہے
جسکے معنی دوری کے ہیں چونکہ شیطان بھی انسانی طبیعت بلکہ ہر بھلائی
اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے اسلئے اس کو شیطان کہتے
ہیں۔ اور اگر یہ لفظ شَیط (جس کے معنی باطل اور سرکشی یا ہلاک
ہونے کے ہیں) سے مشتق مانا جائے تو شیطان کو اسلئے شیطان
کہا جاتا ہے کہ وہ بھی سرکشی اور ہلاکت میں پڑ گیا ہے۔ اور
رَجِیْم۔ رجم سے مشتق ہے جس کے معنی لعنت کرنا پتھر
مارنا ہے۔ چونکہ شیطان بھی ملعون ہے اور آسمان سے شہاب
ثاقب کو فرشتے شیطان پر پھینک کر اسے ہانکتے ہیں اسلئے
شیطان کو رجیم کہتے ہیں
سوال (۱۰) اعوذ باللہ کو بسم اللہ کیساتھ
ملا کر پڑھنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ **جواب**:۔
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ میں شیطان کے زہر سے بچاؤ کا ذکر ہے اسلئے
ساتھ ہی بسم اللہ پڑھی جاتی ہے کیونکہ اس میں مسلمانوں
کے لئے شفا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ معاصی کے دروازے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کہہ کر بند کر دو اور بندگی کے دروازے بِسْمِ اللّٰہِ کہہ کر کھول دو۔

سوال (۱۱) قرآن مجید کی ابتدا کس سے ہوئی ہے؟

جواب:۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے۔

سوال (۱۲) بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید کا سرنامہ بنایا ہے اس سے کیا مفہوم ظاہر ہوتا ہے؟ **جواب:۔** یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب آقا اپنے غلام کی طرف کوئی خط لکھتا ہے تو آقا کی مرضی و نامرضی خط کے عنوان ہی سے معلوم ہو جاتی ہے یہاں بھی خدا تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب کا عنوان جو درحقیقت اس کے بندوں کی طرف اس کا ایک عظیم الشان فرمان ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ رکھا اور اس کی بجائے بِسْمِ اللّٰہِ الْجَبَّارِ الْقَہَّارِ نہ فرمایا تاکہ ہم کو صاف معلوم ہو جائے کہ وہ ہم سے بالکل راضی اور خوش ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ب۔ یہ ب یہاں مدد طلب کرنے کے معنی دیتا ہے۔ اسم کے معنی نام۔ **اللہ**۔ ذات باری تعالیٰ کا نام۔ **بِسْمِ اللّٰہِ** کے معنی ہوئے "میں مدد طلب کرتا ہوں یا میں شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے۔ **اَلرَّحْمٰنِ**۔ بہت رحم کرنے والا۔ **اَلرَّحِیْمِ**۔ نہایت مہربان۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے معنی ہوئے۔ "میں مدد طلب کرتا ہوں یا شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بہت رحم کرنے والا نہایت مہربان ہے

سوال (۱۳) نام کو اسم کیوں کہتے ہیں؟ **جواب:۔** بصرہ کے نحوی کہتے ہیں کہ اسم۔ سُمُوٌّ سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی اور ظہور کے ہیں پس نام کو اسم اسلئے کہتے ہیں کہ یہ اپنے مسمی کیلئے رفعت و ظہور کا باعث ہے۔ کیونکہ نام ہی سے مسمی پہچانا جاتا ہے۔ اور گمنامی کی پستی سے شہرت کی بلندی پر پہنچتا ہے۔ اسلئے مشہور آدمی کو نامور کہتے ہیں۔ اور کوفہ کے نحوی یہ کہتے ہیں کہ اسم کا لفظ سِمَۃ سے بنا ہے جس کے معنی علامت کے ہیں۔ چونکہ نام اپنے مسمی کیلئے گویا علامت و نشانی ہے اس لئے نام کو اسم کہنے لگے۔

سوال (۱۴) اسم اور مسمّٰی ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں یا نہیں اور نام رکھنے کی کیا غرض ہوتی ہے؟

جواب:۔ الگ ہوتے ہیں کیونکہ مسمّٰی ایک ہوتا ہے مگر اسکے نام بہت ہوتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ ایک ہے لیکن اس کے اسمائے حسنیٰ بہت ہیں۔ اگر اسم اور مسمی میں عینیت ہوتی تو جتنے اسمائے حسنیٰ ہیں اتنے خدا ماننا پڑتا جو یقیناً غلط ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر اسم اور مسمی ایک ہوتے تو نام میں مسمی کا اثر موجود ہوتا جیسے آگ کا نام لیتے ہی فوراً اس کی حرارت بھی معلوم ہو جاتی جب ایسا نہیں ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ اسم الگ چیز ہے اور مسمی ایک الگ دونوں میں کوئی یگانگت نہیں ہے اسی لئے ایک نام کے کئی شخص ہوتے ہیں اور کئی شخصوں کا ایک نام ہوا کرتا ہے اور نام رکھنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی چیز کو اپنے مقررہ الفاظ سے تعبیر کیا جائے۔

شبہ۔ جب اسم اور مسمّٰی ایک دوسرے سے

سے الگ ہوا کرتے ہیں تو جو کسی نے اگر مثلاً کہا کہ "زینب کو طلاق ہے" تو طلاق نہ پڑنی چاہیئے کیونکہ طلاق عورت کے نام پر دیجا رہی ہے نہ کہ عورت کی ذات پر۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ "زینب کو طلاق ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جو ذات لفظ زینب سے تعبیر کی جاتی ہے اس پر طلاق ہے۔ لہٰذا شبہ کرنا غلط ہوا۔ اگر کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے اس قول تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ یعنی تمہارے پروردگار کا نام بڑا بارکت ہے (پ ۲۷ ع ۱۳) میں ذات باری تعالیٰ متبارک ہے نہ کہ یہ حروف جو اسمائے الہٰی میں موجود ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے اس قول سے یہ ثابت ہوا کہ اسم اپنے مسمّٰی کا عین ہوا کرتا ہے نہ کہ غیر۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو جس طرح ذات باری تعالیٰ کو ہر قسم کے عیوب سے پاک کہنا لازم ہے بالکل اسی طرح ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ان الفاظ کو بھی جو خدا تعالیٰ کے لئے بطور نام کہے جاتے ہیں ہر قسم کے عیوب سے منزہ سمجھیں اور بیان کریں"۔

الحاصل۔ اسم اور ہے اور مسمّٰی اسکے سوا ہوتا ہے، اور کوئی اسم اپنے مسمّٰی کا عین نہیں ہوتا

سوال (۱۵) بِسْمِ اللّٰہِ (یعنی اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں) کے بجائے بِاللّٰہِ (یعنی اللہ کے ساتھ شروع کرتا ہوں) کیوں نہ کہا گیا؟ جواب اس واسطے کہ جس طرح ذات باری تعالیٰ بابرکت ہے اسی طرح اس کا نام بھی متبرک ہے۔

سوال (۱۶) اللہ کے ساتھ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فرمایا تاکہ خوف کے ساتھ رحمت بھی پائی جائے۔ اور ایک مقام پر جس سے خوف و دہشت طاری ہو تو دوسری جگہ اسکی طرف رغبت بھی پیدا ہو کیونکہ ترہیب کے ساتھ ترغیب ملکر وہی اثر پیدا کرتی ہے جو زخم کے ساتھ مرہم اور شکستگی کیساتھ مومیائی۔

سوال (۱۷) اللہ تعالیٰ کے نام کس لحاظ سے رکھے جاتے ہیں؟ جواب:۔ اللہ تعالیٰ کے نام ان کے اپنے نتائج کے لحاظ سے رکھے جاتے ہیں جو فضل و زنانہ ہیں۔ ان کا اس بات کے اعتبار سے نہیں رکھے جاتے جو درحقیقت اثر قبول کرتے ہیں۔ جیسے رحمٰن و رحیم رحمت سے مشتق ہیں اور رحمت کے لغوی معنی دل کا رقیق ہو کر دوسروں کے ساتھ احسان کرنے کے لئے رغبت کرنے کے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ایسی کیفیات سے منزہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو جب رَحْمٰن و رَحِیْم کہتے ہیں تو اس سے رقت قلبی کا نتیجہ مراد ہوتا ہے جو فضل و احسان ہے۔ یعنی رحمت الہٰی سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو ثواب اور بھلائی پہنچاتا ہے اور ان سے برائی دفع فرماتا ہے۔

سوال (۱۸) اسمائے الہٰی کتنے قسم کے ہیں؟ جواب دو قسم کے (۱) بعض ایسے اسماء ہیں جن کا اطلاق دوسرے معنی میں غیر خدا پر بھی ہو سکتا ہے جیسے رَحِیْم۔ رَؤُوْف۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیۃ میں لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (بے تحقیق تمھارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں)

تمھاری تکلیف انکو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمھاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں (پ۱۱ ش۵)) میں رؤف اور رحیم فرمایا ہے (۲) اور بعض ایسے اسمائے الٰہی ہیں جن کا اطلاق کسی صورت غیر خدا پر نہیں ہوتا جیسے اللہ اور رحمٰن

سوال ۱۹ - رحمٰن غیر کا وصف کیوں نہیں ہو سکتا؟

جواب - رحمٰن اسکو کہتے ہیں جو حقیقی انعام کرنے والا ہو اور یہ صفت صرف خدا تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے کیونکہ جو شخص بھی کسی پر احسان کرتا ہے تو وہ اسکے معاوضہ کا طالب ہوتا ہے خواہ مخلوق سے ہو یا خدا تعالےٰ سے لیکن اللہ تعالیٰ خود جوادِ مطلق ہے اسلئے وہ ایسا احسان کرنے والا ہے جو کسی معاوضہ کی طلب میں نہیں کرتا۔ لہٰذا خدا تعالیٰ کے سوا رحمٰن کسی کا وصف نہیں ہو سکتا۔

سوال ۲۰ - رحمٰن اور رحیم میں کیا فرق ہے؟

جواب - (۱) ایک فرق تو مقدار اور گنتی کے اعتبار سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو رحمٰن الدنیا کہا جا سکتا ہے لیکن رحیم الدنیا نہیں کہتے۔ ہاں رحیم الآخرۃ کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں دونوں پر اپنے احسان فرماتا ہے۔ دوست دشمن یعنی مسلمان اور کافر سب کی پرورش فرماتا ہے! اور رحیم الآخرۃ اسلئے کہا جاتا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت صرف اپنے دوستوں یعنی ایمانداروں پر ہی نازل فرمائیگا۔ کافروں پر نہیں۔ پس رحمٰن کا تعلق لوگوں کی زیادہ تعداد کے لحاظ سے تو یہ ہوا۔ (۲) اب کیفیت کے لحاظ سے زیادتی میں دیکھا جائے تو بھی رحیم سے رحمٰن کے معنی میں ہی زیادتی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ رحیم آخرت کی نعمتیں عطا کرنے والے کو کہتے ہیں اور رحمٰن ایسے احسان کرنے والے کو کہتے ہیں جو آخرت کی نعمتیں دینے کے علاوہ دنیا کی نعمتوں سے بھی سرفراز فرماتا ہے۔

سوال ۲۱ - بسم اللہ میں حق تعالےٰ کے تین نام اللہ۔ الرحمٰن۔ الرحیم کی ترتیب کس بنا پر ہے؟

جواب - قاعدہ ہے کہ جب کسی کا ذکر کیا جائے تو پہلے اسکا سب سے بزرگ نام لیا جائے۔ پھر اسکی صفات لائی جائیں۔ چونکہ الوہیت غیر خدا کیلئے نہ بلحاظ نام ہے نہ باعتبار معنی اسلئے پہلے سب سے زیادہ خاص نام اور الوہیت و معبودیت پر دلالت کرنے والا نام اللہ لایا گیا۔ پھر رحمٰن جو اللہ تعالیٰ کا ایسا نام ہے جو اسی کیلئے مخصوص ہے۔ اگرچہ اس نام کے معانی کا کچھ حصہ مخلوق میں بھی پایا جاتا ہے یعنی کسیقدر صفت رحمت بخلاف الوہیت و معبودیت کے جس کا کچھ حصہ بھی مخلوق میں نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا اللہ کے بعد رحمٰن لایا گیا پھر رحیم جو رحمٰن سے کم ہے اور غیر خدا کا نام ہو سکتا ہے۔

سوال ۲۲ - ادنیٰ سے اعلیٰ کیطرف چلنا چاہئے مگر

بِسْمِ اللہ میں اس اصول کے برعکس کیوں کیا گیا اور اللہ تعالیٰ کے ان صفاتی ناموں میں رحمٰن سے پہلے رحیم کیوں نہ کہا گیا؟

جواب۔ (۱) رحمٰن میں بلحاظ عدد اور باعتبار کیفیت دنیا کی رحمت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ چونکہ دنیا کی رحمت آخرت کی رحمت سے پہلے ہوتی ہے اسلئے رحمٰن کو رحیم پر مقدم کیا گیا (۲) لفظ رحمٰن بڑی نعمتوں پر شامل ہے اور لفظ رحیم ان چھوٹی چھوٹی نعمتوں پر شامل ہے جو چھوٹی ہونے کی وجہ لفظ رحمٰن کے مفہوم سے خارج ہو گئی تھیں یعنی رحمٰن وہ ہے جو بڑی بڑی چیزیں عطا کرے جیسے مال اولاد وغیرہ۔

سوال ۲۳۔ قرآن مجید کس حرف سے شروع ہوا ہے؟

جواب۔ حرف (ب) سے کیونکہ سب سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے۔

سوال ۲۴۔ کلامِ الٰہی حرفِ (ب) سے شروع ہونے میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں؟

جواب۔ (ب) عربی میں ملانے اور معیت کے لئے آتا ہے۔ چونکہ کلامِ الٰہی نازل کئے جانیسے یہی مقصود تھا کہ بندے اللہ تعالیٰ سے قُرب حاصل کریں اور معیتِ الٰہی سے مشرف ہوں اسلئے (ب) سے کلام شروع کیا گیا۔ علاوہ ازیں تمام بنی آدم نے روزِ میثاق اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) کے جواب میں ایک زبان ہو کر بَلٰی یعنی کیوں نہیں (بیشک تو ہمارا رب ہے) کہا تھا تو سب سے پہلا حرف جو بنی آدم کی زبان سے نکلا وہ بھی (ب) تھا۔ اسی حکمت کے مدنظر قرآن مجید بھی بِسْمِ اللّٰہ سے شروع ہوا تاکہ تلاوت کے وقت بھی وہی حرف (ب) زبان زبان سے پہلے نکلے اور انسان اس بلیٰ کے عہد کو یاد کر کے احکام قرآنی کا پابند رہے۔

سوال ۲۵۔ کلام الٰہی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے شروع ہونے پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ایسے الفاظ ہیں جو بندوں کیطرف سے کہے جانیکے قابل ہیں یعنی "میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان نہایت رحم والا ہے" اور ایسے الفاظ کلامِ الٰہی میں کیسے ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تو اسکے بجائے مثلاً یوں ہوتا کہ "میں انسانوں کی ہدایت کے واسطے شروع کرتا ہوں" یا اسی قسم کی کوئی دوسری عبارت ہوتی جس سے اس امر کا پتہ چلے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے بندوں کا نہیں؟

جواب۔ الہامی کتابوں کا طرز بیان ایسا ہی ہوتا ہے جس میں کہیں متکلم کا صیغہ استعمال ہوتا ہے تو کہیں غائب کا اور کہیں حاضر کے صیغہ سے مطلب کی ادائی ہوا کرتی ہے۔ کبھی بندوں کو سکھانے کیلئے ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جو بندوں کی زبان سے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں بطور دعا یا گذارش کہے جانیکے قابل ہوں جیسا کہ بِسْمِ اللّٰہ اور سورۂ فاتحہ وغیرہ میں دعائیہ الفاظ ہیں تاکہ بندے کلام الٰہی کو اپنی زبان سے ادا کر کے ثواب پانے کے علاوہ بارگاہ قدس میں اپنی بھلائی کیلئے بھی عرض کر سکیں جس سے

اللہ تعالیٰ کو ہی ہر چیز کا فاعل حقیقی بھی سمجھا جاسکے۔

سوال ۲۶ - قرآن مجید کا کونسا سورہ ہے جس سے پہلے بِسۡمِ اللہ نہیں ہے؟

جواب - سورۂ برأت ہے۔

سوال ۲۷ - صرف اسی سورہ کیساتھ بِسۡمِ اللہ کیوں نہیں لکھی گئی؟

جواب - اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سورۂ انفال اور سورۂ برأت بقول بعض ایک ہی سورۃ ہے اسلئے یہاں بِسۡمِ اللہ (جو سورتوں کے فصل کیلئے ہے) نہیں لکھی گئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں مسلمانوں کو کفار سے جنگ پر ابھارا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ بِسۡمِ اللہ امن کی آیت ہے اور امن وخوف کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں بعض سلف نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ عرب کا یہ طریقہ تھا کہ جب وہ کسی قوم سے اپنے کئے ہوئے عہد وپیمان کو توڑنے کیلئے خط لکھا کرتے تو اس خط کے شروع میں بِاسۡمِکَ اللّٰھُمَّ نہیں لکھتے تھے جو زمانہ جاہلیت میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے طور پر لکھا جاتا تھا۔ چونکہ یہ سورہ بھی مشرکین سے مقررہ عہد باقی نہ رکھنے کیلئے نازل ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو مشرکین کے پاس جا کر اس سورۃ کو پڑھ کر سنانے کہا تو عرب کی اس عادت کے موافق بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نہیں پڑھی۔ اس لئے قرآن مجید میں بھی اس سورہ سے پہلے بِسۡمِ اللّٰہِ نہیں لکھی گئی۔

سوال ۲۸ - بِسۡمِ اللہ کس کس پیغمبر پر نازل ہوئی؟

جواب - لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام پر نازل ہوئی اور آپکے انتقال کے بعد اٹھالی گئی پھر حضرت نوح علیہ السلام پر نازل ہوئی جو آپکے انتقال کے بعد اٹھالی گئی اور اسی کی برکت سے آپکی کشتی طوفان میں محفوظ رہی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئی تو آپ پر اسکی برکت سے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی نازل ہوئی اور پھر آپکے بعد اٹھالی گئی۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام پر نازل ہوئی چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیۃ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَسُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا یعنی اور ہم نے (حضرت) داؤد وسلیمان (علیہما السلام) کو علم عطا فرمایا (پ ۱۹ ر ۱۶) میں علم سے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سکھانا مراد ہے (نزہۃ المجالس) جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو خط لکھتے وقت اپنے خط کے شروع میں لکھی تھی جسکا ذکر پ ۱۹ ر ۱۸ میں ہے۔ لیکن مستند تفاسیر میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر ایک آیۃ نازل ہوئی ہے جو سوائے (حضرت) سلیمان (علیہ السلام) کے کسی نبی پر نہیں اتری اور وہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہے۔

سوال ۲۹ - اس کی کیا وجہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی میں سوار ہونے وقت بِسۡمِ اللّٰہِ مَجۡرٖىهَا وَمُرۡسٰىهَا (یعنی اس (کشتی) کا چلنا اور اسکا ٹھیرنا (سب) اللہ تعالیٰ ہی کے نام سے ہے) (پ ۱۲ ر ۴) پڑھا! اور پوری بِسۡمِ اللہ نہیں پڑھی)؟

جواب - چونکہ طوفانِ نوح عذابِ الٰہی تھا ایسے موقع پر اسم اللہ کیساتھ رحمت والے نام[1] لینا اسلئے مناسب نہ تھا کہ رحمت اور عذاب ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ذبح کے وقت بھی اَللّٰہُ اَکْبَر سے پہلے صرف بِسْمِ اللّٰہ ہی کہا جاتا ہے (اگر کوئی ذبح کے وقت عمداً بِسْمِ اللّٰہ نہ کہے تو حنفی مذہب میں وہ ذبیحہ مردار ہو جاتا ہے) اور اسکے ساتھ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اسلئے نہیں کہتے کہ خواہ حلال جانوروں کے ذبح کرنے میں کتنی ہی مصلحتیں پوشیدہ ہوں مگر پھر بھی ذبح کرنا بظاہر خلافِ رحمت ہے اور یہ دونوں نام رحمت کے ہیں۔

قرطبی نے لکھا ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اس امتِ محمدیہ کی خصوصیات اور فضائل میں سے ہے۔ میزانِ قیامت میں امتِ محمدیہ کی ایک رکعت نماز ایک پلڑے میں اور دیگر امتوں کی ہزار رکعت نماز دوسرے پلڑے میں رکھکر تولی جائے تو یہ ایک رکعت نماز والا پلڑہ ہی وزنی ہوگا۔ اہلِ محشر یہ دیکھکر تعجب کریں گے تو ان سے کہا جائیگا کہ امتِ محمدیہ کی ایک رکعت نماز کی یہ عظمت اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنی نمازوں میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھا کرتے تھے۔

سوال ۳۰ - کیا ہر کام کے شروع میں ہی بِسْمِ اللّٰہ کہنا چاہیے یا اختتام پر بھی کہہ سکتے ہیں؟

جواب - بسملہ کا یہی مطلب نہیں کہ سب کاموں کا صرف شروع ہونا ہی اللہ تعالیٰ کے نام سے ہونا ہے بلکہ ہر ایک کا اختتام بھی اللہ تعالیٰ ہی کے نام سے ہے اسلئے کام کے اختتام پر بھی بِسْمِ اللّٰہ کہہ سکتے ہیں

---

[1] اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب اس بیان کردہ نکتہ کے تحت الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نہیں کہا گیا تو پھر کس لئے حضرت نوح علیہ السلام نے اسکے بعد ہی اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (یعنی) بالیقین میرا رب بخشنے والا مہربان ہے (پ ۱۲ ع ۴) کہا جبکہ غفور و رحیم بھی رحمت والے ہی نام ہیں؟ **جواب** - یہ دونوں نام بھی اگرچہ رحمت ہی کے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ محض یہ ایمانداروں سے متعلق ہیں مبتلائے عذاب مشرکین سے بالکل نہیں۔ کیونکہ غَفُوْر گناہ بخشنے والے کو کہتے ہیں شرک تو بخشا نہیں جاتا جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس کے سوائے جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیگا (پ ۵ ع ۵) ایسا ہی رَحِیْم اس کو کہتے ہیں جو صرف اپنے فرمانبرداروں پر رحم کرتا ہے اور نافرمانوں پر رحم نہیں کرتا۔ اس طوفان کے وقت حضرت نوح علیہ السلام کو ایک طرف مشرکین کو رحمتِ الٰہی سے الگ رکھنا تھا دوسری طرف اپنے ساتھ کشتی میں سوار ایمانداروں کے لئے طلبِ رحمت کی ضرورت تھی تاکہ وہ سلامت رہ کر اس عذابی طوفان سے نجات پالیں۔ اس لئے آپ نے اس پہلو کو مدنظر رکھکر پوری بسم اللہ نہیں پڑھی کیونکہ اس میں رحمٰن کا بھی لفظ ہے جس سے مشرک و مومن سب رحمت میں شامل ہو جاتے کیونکہ رحمٰن ایسے رحم کرنیوالے کو کہتے ہیں جو اپنے فرمانبردار اور نافرمان دونوں پر رحم کرتا ہے اسلئے اس کے بجائے اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ کہا تاکہ دونوں مقصد حاصل ہو جائیں یعنی مشرکین عذابِ الٰہی سے برباد ہو جائیں کیونکہ متذکرہ دونوں ناموں کے تحت وہ شامل نہیں اور ایماندار ان دونوں ناموں میں غفور و رحیم کے تحت شامل ہو کر طوفان سے نجات پا جائیں ۱۲

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم میں سے جب کوئی کھانا کھائے تو بِسمِ اللہ کہے اور اگر ابتدا میں بِسمِ اللہ کہنا بھول جائے تو درمیان میں جس وقت یاد آجائے تو فوراً بِسمِ اللہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ کہہ لے۔ لکھا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جب بِسمِ اللہِ مَجرٖیھا (یعنی اس (کشتی) کا چلنا اللہ تعالےٰ ہی کے نام سے ہے) کہتے تو کشتی چلنے لگتی اور جب بِسمِ اللہِ مُرسٰھا (یعنی اس (کشتی) کا ٹھیرنا اللہ تعالےٰ ہی کے نام سے ہے) کہتے تو کشتی ٹھیر جاتی تھی۔ الغرض بِسمِ اللہ جس موقع پر پڑھی جاتی ہے وہاں اسی قسم کا فعل بِسمِ اللہ کی (ب) میں مقدر مانا جاتا ہے۔ جیسے بوقتِ ذبح بِسمِ اللہ کہنے کے معنی ہونگے "میں اللہ تعالےٰ کے نام سے ذبح کرتا ہوں۔ کھانا شروع کرتے وقت بِسمِ اللہ کہنے کے یہ معنی ہونگے کہ "میں اللہ تعالےٰ کے نام سے کھانا شروع کرتا ہوں"۔ کھانے سے فارغ ہوکر بِسمِ اللہ کہنے کے معنی یہ ہونگے کہ "میں اللہ تعالےٰ کے نام پر اپنے کھانے سے فراغت پاتا ہوں۔ اگر اَبدَءُ (یعنی میں شروع کرتا ہوں) کو ہی بِسمِ اللہ کی (ب) میں محذوف مانا جائے جیسا کہ بعض علما نے کہا ہے تو کسی فعل کے اختتام پر بِسمِ اللہ پڑھنا غیر موزوں ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کام ختم کرتے وقت یہ کہنا کہ میں اللہ تعالےٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں خلاف واقع اور غلط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا پہلا قول ہی بہت صحیح ہے۔

مسائل

سوال ۳۱۔ بحالت نماز اور نماز کے علاوہ حالت میں تعوّذ کے کیا احکام ہیں؟

جواب۔ نماز میں اور نماز کے علاوہ حالت میں قرائت سے پہلے تعوّذ اَعُوذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیم پڑھنا سنت ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سب سے پہلے وحی لیکر آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "اَعُوذُ پڑھیئے"۔ اور نماز کے علاوہ جب کوئی آیاتِ قرآنی پڑھے تو تعوذ کو اونچی آواز سے پڑھا جائے البتہ نماز میں تعوّذ اور بِسمِ اللہ کو حنفی مذہب میں آہستہ پڑھنا درست ہے خواہ اس نماز میں قرات آہستہ پڑھی جائے یا بلند آواز سے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "چار چیزیں ہیں جنکو امام آہستہ پڑھنا چاہیے (۱) تعوّذ (۲) بسملہ، (۳) آمین (۴) رَبَّنَا لَکَ الحَمدُ"۔ اور حضرت امام شافعیؒ کے پاس بلند آواز سے اور آہستہ دونوں طرح تعوّذ جائز ہے۔

سوال ۳۲۔ حالت نماز میں کب اَعُوذُ باللہ پڑھا جا سکتا ہے اور کب نہیں؟

جواب۔ جو شخص نماز میں قرائت یعنی آیات قرآنی پڑھے جیسے امام یا اکیلا نماز پڑھنے والا تو قرائت سے پہلے اسکو اَعُوذُ پڑھنا چاہئے کیونکہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کہتے ہیں کہ تعوّذ قرات کا تابع ہے ثنا کا تابع نہیں یعنی جس حالت میں صرف ثنا پڑھی جائے اور قرائت نہ پڑھی جائے جیسے مقتدی

کہ وہ صرف ثنا پڑھ کر امام کے پیچھے خاموش کھڑا رہتا ہے اعُوذ نہ پڑھے۔

سوال ۳۳۔ بِسْمِ اللّٰہ کیسے کاموں پر کہا جا سکتا ہے۔

جواب۔ ہر ایسے موقع پر بِسْمِ اللّٰہ کہنا جائز ہے جو شرعاً مباح ہو۔ ناجائز کاموں پر بِسْمِ اللّٰہ کہنا گناہ ہے۔ فقہا نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی نے حرام کام پر بِسْمِ اللّٰہ کہا تو کافر ہو جاتا ہے۔

انتباہ:۔ بعض لوگ جو بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی میم کو اَلْحَمْدُ کے الف لام سے کسی عمل وغیرہ کیلئے یا بطور قرائت ملا کر پڑھا کرتے ہیں وہ سنت کے خلاف کرتے ہیں۔ بلکہ بِسْمِ اللّٰہ پڑھنے کے بعد ٹھہر کر دوسری آیۃ پڑھنی چاہئے۔ جیسا کہ حضرت اُم سلمہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الگ الگ پڑھتے تھے یعنی ہر آیۃ پر وقف کرتے اور ایک کو دوسرے سے نہ ملاتے۔

سوال ۳۴۔ کیا بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہر سورہ کا جزو ہے؟

جواب۔ حضرت امام شافعیؒ کے علاوہ ائمہ ثلاثہ یعنی (۱) حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ (۲) حضرت امام مالکؒ (۳) حضرت امام احمد حنبلؒ فرماتے ہیں کہ "سورتوں کے پہلے جو بِسْمِ اللّٰہِ لکھی جاتی ہے۔ وہ صرف دو سورتوں کے درمیان جدائی اور فصل ظاہر کرنے کے واسطے لکھی جاتی ہے نہ یہ کہ وہ ہر سورہ کی آیۃ اور اسکا جزو ہے۔" چنانچہ وہ ہر سورہ کا اگر جزو ہوتی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ابتدائے وحی کے وقت سورۂ اقرأ سے پہلے بھی ضرور بِسْمِ اللّٰہ کا ذکر کرتے جب آپ نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ بِسْمِ اللّٰہ سورہ کا جزو نہیں ہے۔ البتہ علمائے امت کے اجماع کے مطابق بِسْمِ اللّٰہ سوائے سورۂ نمل کے کسی اور سورہ کا جزو نہیں ہے۔ اور نماز میں سورۂ فاتحہ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہ پڑھنا مسنون ہے۔ اور سورۂ فاتحہ کے بعد چونکہ دوسرا سورہ ملانے کا حکم ہے اس لئے بِسْمِ اللّٰہ نہ پڑھے کیونکہ وہ سورتوں کے فصل کیلئے نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسوقت تک ایک سورہ کو دوسرے سورے سے جدا نہیں جانتے تھے جب تک کہ آپ پر بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نازل نہیں ہوتی تھی۔

سورۂ فاتحہ کے نازل ہونیکا واقعہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب میں آبادی کے باہر جاتا تو "یا محمدُ" کی آواز سنتا۔ اور آسمان و زمین کے درمیان زرین تخت پر ایک نورانی شخص کو معلق دیکھتا جس سے خوف زدہ ہو کر بھاگتا تھا۔ جب کئی بار ایسا ہی ہوتا گیا تو ورقہ بن نوفل (جو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے چچا کے بیٹے تھے اور توریت و انجیل سے بخوبی واقف) کے پاس جا کر میں نے ان سے تمام ماجرا بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ "آئندہ جب آپ ویسی آواز سنیں تو نہ بھاگئے بلکہ سنئے کہ آخر وہ

کیا کہتے ہیں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے ویسا ہی کیا اور مجھے پہلے کی طرح جب یا محمدؐ کی آواز آئی تو (ٹھیر کر) لبیک کہا جس کے جواب میں اس پکارنے والے نے کہا "میں جبرئیلؑ ہوں اور آپ اس امت کے نبی ہو" پھر کہا "کہو اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ"۔ پھر اَلْحَمْدُ کو آخر سورہ تک کہہ سنایا۔

اس واقعہ پر ذہنوں میں دو اعتراض پیدا ہو سکتے ہیں (۱) جب سورۂ فاتحہ سے پہلے آپ پر سورۂ اقرأ وغیرہ نازل ہو چکے تھے تو پھر آپ حضرت جبرئیلؑ کی آواز سنکر انکے ہیبل سے کیوں خوفزدہ ہوئے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ نبی مرسل اور مقرب فرشتوں سے بھی افضل تھے لیکن پھر بھی بشریت کے ہی لباس میں تھے اور یہ بشریت کا تقاضہ ہے کہ جب انسان کو کسی اجنبی چیز سے سابقہ پڑتا ہے تو اُسے ضرور خوف پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بقعۂ مبارکہ میں سے اَنَا اللّٰهُ (میں اللہ ہوں) کی آواز آئی پھر حکم الٰہی سے اپنے عصا کو زمین پر ڈالتے ہی جب وہ سانپ کی طرح حرکت کرنے لگا تو اس سے ڈر کر حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسا بھاگنے لگے کہ مڑ کر تک نہ دیکھا جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا يٰمُوْسٰى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ۝ یعنی اے موسیٰؑ آگے آؤ اور تم نہ ڈرو بیشک تم کو امن ہے (کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا) (پ ۲۰) پس جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس موقع پر خوف زدہ ہونا اور اپنے معجزے سے بھاگنا بشریت کی وجہ سے تھا بالکل اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہیکل عظیم کو آسمان و زمین کے درمیان معلق دیکھنے سے خوفزدہ ہونا بھی بشریت کی وجہ سے تھا جو نزول وحی کے ابتدائی زمانے میں ایک دو بار ہوا۔ پھر جب آپ میں ملکی اثر قوی ہو چکا تو آپ سے وحشت اور خوف بالکل جاتا رہا۔

دوسرا اعتراض یہ کہ آپ حضرت ورقہ بن نوفل کے پاس کیوں گئے؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ انسان طبعاً کسی خوف کے وقت دانشمند ہم جنس سے مل کر انس پیدا کرنا چاہتا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے مدنظر حضرت ورقہ کے پاس گئے جو عالم اور صاحب شعور تھے تاکہ اُن سے اپنی وحشت کا اظہار کیا جائے تو سکون پیدا ہو جائے کچھ فیض یاب ہونے نہیں گئے تھے۔

سورۂ فاتحہ کے نازل ہونے سے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ناگہاں ایک آواز اوپر سے سنی گئی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ "آسمان کا ایک دروازہ کھلا ہے

جو آج تک کبھی نہیں کھلا تھا۔" چنانچہ اس دروازہ سے ایک فرشتہ اترا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ کو بشارت ہو ایسے دو نور کی جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دئے گئے ایک فاتحۃ الکتاب دوسرا اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے سورہ کے آخر تک۔"

سورۃ الفاتحۃ مکیۃ وھی سبع اٰیات

سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱﴾ اَلرَّحْمٰنِ

سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے جو سب عالموں کا پالنے والا ہے — بڑا مہربان

الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ

نہایت رحم والا ہے — مالک ہے بدلہ کے دن کا — تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں — بتلا ہم کو راستہ

الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ

سیدھا — راستہ ان کا جن پر تو نے انعام کیا — نہ

الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

ان کا جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور نہ انکا جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

سوال ۳۵۔ چونکہ قرآن مجید میں سب سے پہلے ہی سورہ لکھا ہوا ہے اس لئے کیا سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے؟

جواب۔ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں جن میں مطابقت اس پر کی گئی ہے کہ دراصل سب سے پہلے سورۂ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ اور نماز کی تعلیم کے سلسلہ میں سب سے پہلے سورہ فاتحہ نازل فرمائی گئی۔

سوال ۳۶۔ قرآن مجید میں سورتوں کے نام اور آیات کی ترتیب کس بنا پر ہے؟

جواب۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی بنا پر۔ اس لئے کہ قرآن مجید وقت واحد میں تو نازل نہیں ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا موقع بموقع (۲۳) برس کی مدت میں نازل ہوتا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پورا قرآن مجید مرتب نہ ہو سکا۔ کیسے مرتب ہوتا جبکہ حیات طیبہ کے آخری زمانہ تک بھی آیات قرآنی کے نازل ہونے کا سلسلہ برابر جاری تھا چنانچہ بعض روایات کے مطابق آپ کی وفات شریف سے نو دن پہلے بھی آیۃ نازل ہوئی ہے۔ تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید لکھا ہوا موجود تھا۔ کیونکہ آپ پر جب کبھی آیتیں نازل ہوتیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام بحکم الٰہی ہر ایک آیۃ کے لکھے جانے کا موقع محل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھا دیتے بتا دیتے۔

اور سورہ کا نام بھی بتا دیتے۔ جسکے بعد آپ کاتب وحی کو بلاتے اور اسکے موافق سمجھا کر وہ نازل شدہ آیتیں فوراً لکھوا دیا کرتے۔ پھر ہر رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نازل شدہ قرآن مجید کا دورہ کیا کرتے بس معلوم ہوا کہ جس ترتیب سے قرآن مجید وقتاً فوقتاً ضرورت کے لحاظ سے نازل ہوا اس ترتیب کے موافق نہیں لکھا گیا بلکہ حکم الٰہی کے موافق لوح محفوظ کی ترتیب کے بموجب حیات طیبہ میں یہ قرآن مجید لکھا جاتا رہا۔ جو اگرچہ سلسلہ وحی جاری رہنے کیوجہ یکجا جمع نہ ہو سکا تھا مگر متفرق طور پر صحابہ کرامؓ کے پاس قرآن مجید اسطرح موجود تھا کہ چند سورتیں ایک صحابی کے پاس تھیں تو چند کسی دوسرے صحابی کے پاس۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے تو مسیلمہ کذاب کے فتنہ کو دبانے کیلئے جنگ کی نوبت آئی جس میں سات سو سے زیادہ حافظ قرآن صحابہؓ بھی شہید ہو گئے۔ جسکے بعد یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر اسی طرح حافظ قرآن صحابہؓ اور وہ صحابہؓ جنکے پاس متفرق طور پر آیات قرآنی لکھی ہوئی ہیں رفتہ رفتہ دنیا سے اٹھ جائیں تو

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ مِائَتَانِ وَسِتٌّ وَثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَاَرْبَعُوْنَ رُكُوْعًا

سورۂ بقرہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اسمیں (۲۸۶) آیتیں اور چالیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

ا۔ل۔م اس کتاب میں کوئی شبہ نہیں ہدایت کرتی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کو

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

جو ایمان لاتے ہیں نہ دیکھی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز کو

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ

اور جو کچھ ہم نے انکو دیا (اسمیں سے) خرچ کرتے ہیں اور جو ایمان لاتے ہیں اُسپر جو

اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴

اتارا گیا آپکی طرف اور اسپر بھی جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں

اُولٰۗىِٕكَ عَلٰي هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۤ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

یہ لوگ ہیں (اس) ہدایت پر جو انکے پروردگار کیطرف سے ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں

نوٹ:۔ مصرع۔ چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار۔ کے مصداق خیال ہوا کہ جب تفسیر کی غرض سے آیات قرآنی لکھنا ہی ہے تو کیوں نہ اسطرح لکھی جائیں جس سے وہ اعجاز بھی ظاہر ہو سکے جو اسکی تحریری نوعیت میں بھی موجود ہے۔ وہ یہ کہ ہر صفحہ قرآنی برابر سے سلسلہ وار ہر سطر کا جو ہر حرف ہے وہی ہر حرف نیچے سے اسکے اپنے مقابل والی سطر میں آ گیا ہے اور صفحہ کی درمیانی سطر کا ہر حرف وہی ہے جو اسکے محاذی صفحہ کی درمیانی سطر کا ہے اور یہ ایسی صنعت ہے جو سوائے کلام الٰہی کے دنیا کی کسی کتاب میں موجود نہیں۔

اسلئے اگرچہ ابھی سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہی کا سلسلہ جاری ہے مگر مصرحۂ بالا نوعیت کے اظہار کی غرض سے محاذی صفحہ پر سورۂ بقرہ کا بھی ایک صفحہ لکھ دیا گیا ہے۔

تو آئندہ قرآن مجید کی کچھ آیتیں ضائع ہو جائیں گی اس اندیشہ کو رفع کرنے کی غرض حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ سے مشورہ کے بعد کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ قرآن مجید کی ان تمام صورتوں کو جو زمانہ رسالت میں لکھی گئی ہیں جمع کریں اور ان میں سے ہر آیت کے بارے میں جب تک کوئی دو صحابی یہ گواہی نہ دیں کہ یہ آیتہ ہمارے سامنے نازل ہوئی ہے اسوقت تک اسکو داخل قرآن نہ سمجھیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور متفرق ورقوں پر لکھی ہوئی آیات کو نہایت تحقیق وصحت کے ساتھ حافظ قرآن صحابہ کرامؓ کی یاد کے موافق سلسلہ وار لکھکر یکجا جمع کر کے قرآن مجید تیار کیا جسے مصحف صدیقی کہا جاتا ہے۔ حضرت والد ماجد فاضل مدظلہٗ فرماتے ہیں ؎

بو بکرؓ کے حکم سے ترتیب قرانی ہوئی
یوں کلام حق کی بھی کی ہے حفاظت دیکھئے

لیکن اس مصحف صدیقی میں وہ سات طرح سے پڑھے جانے والے الفاظ بھی لکھے گئے تھے جسے ہجرت کے بعد ان مختلف قبیلوں کے نئے مسلمان ہونے والے صحابہ کیلئے بطور رعایت پڑھنے کی اسلئے اجازت دیگئی تھی کہ انکا محاورہ قریش کے محاورہ سے الگ تھا اور انکی زبانوں پر قریش کے محاورہ کے لفظ مشکل سے چڑھتے تھے مثلاً امیں کے بعض لوگ حتّٰی کو عتّٰی کہتے تھے۔ چنانچہ یہ چیز حضرت عمرؓ کی خلافت تک قرآن میں باقی رہی۔ مگر حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت میں ان مختلف لفظوں کے سبب سے جب لوگوں میں طرح طرح کے جھگڑے پیدا ہونے لگے تو حضرت عثمانؓ نے اس معاملہ صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا۔ سب کی رائے یہ ہوئی کہ ان مختلف لفظوں کو نکالکر قریش کے محاورہ کے موافق قرآن مجید کو لکھا جائے اور اسکی نقلیں کرائی جاکر ممالک اسلامیہ میں بھیجدی جائیں اور اسی ایک قرائت کا سب کو پابند کر دیا جائے۔ بنا براں مصحف صدیقی کے ان تمام اختلافی الفاظ کو نکالکر محاورہ قریش کے موافق قرآن مجید لکھا گیا جسے مصحف عثمانی کہا جاتا ہے اور اسی کو رائج کیا گیا وہ اس طرح کہ حضرت عثمانؓ نے ایک قرآن کو اپنے پاس مدینہ طیبہ میں رکھ لیا اور اسکی چار نقلیں چاروں طرف اسلامی ممالک میں بھیجکر یہ تاکیدی حکم دیدیا کہ ہر جگہ اس مصحف کی نقلیں کر لیجائیں اور اس سے پہلے کے تمام قرآن تلف کر دئے جائیں تاکہ مسلمانوں کے یہ اختلاف مٹ جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آجتک ہر جگہ وہی قرآن موجود ہے اور قیامت تک رہیگا۔

چونکہ مصحف عثمانی تیار ہونے کے زمانہ میں زبر، زیر، پیش، جزم، تشدید کی علامات مقرر نہ تھیں اسلئے بعض الفاظ قرآنی کو اعراب وغیرہ کے ایسے تغیر سے جنکی وجہ کوئی معنوی غلطی نہوتی جو پڑھنے کا طریقہ جاری ہوا جسے آجتک ان سات ائمہ قرائت (۱) نافعؒ (۲) ابن عامرؒ (۳) ابو عمروؒ (۴) حمزہؒ (۵) ابن کثیرؒ (۶) عاصمؒ (۷) کسائیؒ کیطرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ قول صحیح ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے موافق

سات طرح پڑھے جانے والے تمام الفاظ موجودہ ساتوں قرائتوں میں نہیں ہیں۔

سوال ۳۷۔ سورۂ فاتحہ کے نام کیا ہیں؟

جواب۔ سورۂ فاتحہ۔ فاتحۃ القران۔ سورۃ الحمد سورۃ الشکر۔ سورۃ الکنز۔ سورۃ الصلواۃ۔ سورۃ المناجات سورۃ السوال۔ سورۃ التفویض۔ سورۃ الحمد الاولیٰ سورۃ الحمد القصریٰ۔ سورۃ الوافیہ۔ سورۂ تعلیم المسئلہ سورہ رقیہ۔ سورۂ شفا۔ شافیہ۔ کافیہ۔ سبع المثانی۔ قرآن عظیم۔ الدعا۔ نور۔ اساس صلوٰۃ۔ ام الکتاب ام القران۔

سوال ۳۸۔ سورۂ فاتحہ اور اسکے دیگر ناموں کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

جواب۔ اس سورہ کو سورۂ فاتحہ اسلئے کہتے ہیں کہ یہ فضائل وعلوم کا مبداء ہے اور ہر بچہ بڑا سب سے پہلے اس سورۃ سے اپنی پڑھائی شروع کرتا ہے اور نماز میں بھی قراءت کا اسی سے افتتاح ہوتا ہے۔

فاتحۃ القران اسلئے کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں سب سے پہلے یہی سورہ ہے اور اسی سے قرآن مجید کا افتتاح ہوا ہے۔

سورۃ الحمد کہنے کیوجہ یہ ہے کہ یہ سورہ اَلْحَمْدُ سے شروع ہوتا ہے۔ اور

سورۃ الشکر اسلئے کہتے ہیں کہ حمد شکر کی بنیاد ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْحَمْدُ رَاسُ الشُّکْرِ مَا شَکَرَ اللّٰہَ عَبْدٌ لَمْ یَحْمِدْہُ یعنی حمد شکر ہے۔ جس بندے نے خدا تعالیٰ کی حمد نہ کی اُس نے شکر بھی نہ کیا۔ رہا یہ کہ حمد کو شکر کی بنیاد کیوں قرار دیا گیا تو اسکی وجہ یہ ہے کہ حمد ہی سے نعمت حاصل ہونیکا اظہار ہوتا ہے کیونکہ حمد زبان سے ہوتی ہے اور شکر چونکہ قول کے علاوہ عمل واعتقاد سے بھی ہوتا ہے اسلئے اگر کوئی شکر اپنے اعضاء سے اسطرح کرے کہ مثلاً محسن کی تعظیم کیلئے کھڑا ہو جائے تو اس میں ریاکاری کا بھی احتمال ہو سکتا ہے یا ایسا قیام تعظیم کے سوائے چلے جانے کی غرض سے بھی ہو سکتا ہے غرض اعضا کے ذریعہ شکر میں دوسرے پہلو بھی ہو سکتے ہیں جو نعمت کی شکر گزاری ہی کو ظاہر نہیں کرتے نیز جو شکر اعتقاداً ہوتا ہے وہ بھی نعمت کو ظاہر نہیں کرتا کیونکہ اعتقاد کا حال مخفی اور پوشیدہ ہوتا ہے۔ پس نعمت کے وجود کو واضح طور پر ظاہر کرنے والی حمد ہی ہے۔ لہذا حمد شکر کی بنیاد ہے۔ اسے

سورۃ الکنز بھی کہتے ہیں چنانچہ سیدنا علیؓ فرماتے ہیں کہ یہ سورہ فاتحہ عرش کے نیچے کے خزانہ سے اترا ہے۔

سورۃ الصلوٰۃ اسلئے کہتے ہیں کہ ہر نماز میں (سوائے نماز جنازہ کے) یہ سورہ پڑھنا واجب ہے۔

سورۃ السوال کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسمیں بندے کی طرف سے جناب باری تعالیٰ میں سوال ہے۔

اساس بھی اسکا ایک نام ہے کیونکہ یہ سورہ تمام الہامی کتابوں کی اصل ہے۔

ام الکتاب بھی کہتے ہیں ام کے معنی اصل کے بھی ہیں اور یہ سورہ بھی کتاب کی اصل ہے علامہ فخر الدین رازیؒ نے اس سورہ سے دس ہزار مسئلے

نکالے ہیں۔

سورۃ التفویض اسلئے کہتے ہیں کہ اس سورۃ کے اندر اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں اس امر کیطرف رہبری کی گئی ہے کہ بندہ اپنے کو اللہ تعالےٰ ہی کے تفویض کرکے خاص اللہ تعالےٰ ہی سے مدد طلب کرے۔

سورۃ الوافیہ اسلئے کہتے ہیں کہ نماز کی ہر رکعت میں یہ پورا سورہ پڑھا جاتا ہے اسکی چند آئتیں پڑھنا درست نہیں بخلاف دوسری سورتوں کے جن کی چند آئتیں بھی ہر رکعت میں پڑھنا جائز ہے علاوہ ازیں چونکہ یہ سورہ پورے معانی قرآن کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے اسلئے بھی اسے سورۃ الوافیہ کہتے ہیں۔

ام القرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے خاص خاص مطالب اس سورہ میں جمع ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں جس قدر بھی اللہ تعالےٰ کی تعریف کی گئی ہے وہ سب اَلْحَمْدُ (ہر طرح کی تعریف) میں مضمر ہے۔ اور جتنے اسمائے حسنیٰ ہیں ان سب پر اللہ (معبود حقیقی کا خاص نام) حاوی ہے۔ اور خدا تعالےٰ کی وہ تمام صفات حمیدہ جو قرآن مجید میں مذکور ہیں رَبِّ (پالنے والا) میں داخل ہیں۔ اور جسقدر مخلوق کا ذکر آیا ہے وہ سب اَلْعٰلَمِيْنَ (تمام عالموں) میں شامل۔ اور معافی و بخشش کا جتنا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ سب الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (بڑا مہربان نہایت رحم والا) کے تحت موجود ہے اور جو وعیدیں اور قیامت کے تمام واقعات مذکور ہیں وہ سب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (مالک ہے بدلہ کے دن کا) میں مندرج ہیں جس سے معاد کو بخوبی ثابت کیا گیا ہے۔ اور جو کچھ عبادات وطاعات (خواہ بدنی ہوں یا مالی) کا ذکر اس قرآن مجید میں موجود ہے وہ سب اِيَّاكَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) میں داخل ہے۔ عاجزی اور سوال کا پورا ذکر وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) میں بھرا ہوا ہے۔ اور جہاں جہاں قرآن مجید میں طلب ہدایت اور برے خاتمے سے خوف کرنیکا ذکر آیا ہے وہ سب اِهْدِنَا (بتلا راستہ ہمکو یا ہماری ہدایت کر) میں داخل ہے۔ اور مقربین بارگاہ الٰہی پر انعام و اکرام کا جو ذکر آیا ہے وہ سب الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (راستہ سیدھا راستہ انکا جن پر تو نے اکرام کیا) میں مذکور ہے۔ اور قرآن مجید میں غیر مسلموں کا جسقدر بیان ہوا ہے وہ سب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (نہ انکا جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور نہ انکا جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں) کے ذیل میں موجود ہے۔

سورۃ تعلیم المسئلہ: سورۂ فاتحہ کو اس واسطے کہتے ہیں کہ اس میں اپنی حاجت کو مانگنے اور سوال کرنیکے طریقے کی تعلیم دیگئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جس سے کچھ طلب کرنا ہو تو سوال کرنے سے پہلے اسکی تعریف وتوصیف کیجائے۔ پھر اپنی اس نسبت کو جو اس سے ہے بیان کرے تاکہ اس سے اپنا سوال کرنا بے تعلق نہ معلوم ہو اسکے بعد جو اپنا سوال ہے وہ پیش کردے اور جو اپنی آرزو ہے اسکو بیان کردے۔ چنانچہ یہی ترتیب اس

سورہ میں پائی جاتی ہے جو اس امر کیطرف ایک لطیف اشارہ کرتی ہے کہ مانگنے کا صحیح طریقہ یہ ہے ۔ وہ اسطرح کہ ابتدائی تین آیتوں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱) اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲) مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (۳) (یعنی ہرطرح کی تعریف اللہ تعالےٰ ہی کے واسطے ہے ۔ جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے (۱) بڑا مہربان نہایت رحم والا (۲) مالک ہے بدلے کے دن کا (۳)) میں بندوں کیطرف سے اللہ سبحانہ وتعالےٰ کی تعریف و توصیف اور اسکی عظمت وجلال کا اقرار ہے ۔ اسکے بعد اس نسبت کے اظہار کیلئے جو مانگنے والے بندہ کو اپنے آقا اور معبود سے ہے یہ آیتہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (۴) ہے کیونکہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں کہنے سے بندے نے اللہ تعالےٰ کو اپنا معبود اور خود کو اسکا عبد یعنی بندہ قرار دیکر عبدیت ومعبودیت کی آپسی نسبت کو ظاہر کردیا اور سو اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یعنی اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں کہنے سے بندے نے اللہ تعالےٰ کی ذات سے اپنی محتاجی کو بھی ثابت کردیا ۔ الغرض جب بندے نے تعریف وتوصیف کے بعد اور اپنی بندگی واحتیاج ذات باری تعالےٰ سے بطور نسبت ووابستگی بیان کردیا تو اس کے بعد حق تعالےٰ نے بندوں کے لئے آخر سورہ تک کی آیات جس میں صرف استدعا ہی ہے بیان فرمادیا تاکہ بندہ اس سے یہ بھی سمجھ لے کہ اب مانگا جاسکتا ہے اور ایسی ہی نوبت پر مانگنے کا صحیح موقع ہوا کرتا ہے ۔ اسلئے اب ان آیات اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۵) صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۶) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (۷) (یعنی بتلا ہمکو راستہ سیدھا (۵) راستہ انکا جن پر تونے انعام کیا (۶) نہ انکا جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور نہ انکا جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں (۷) کو پڑھ کر بارگاہ صمدیت میں اپنا مدعا عرض کردے

سورۃ المناجات بھی اسی کا نام ہے کیونکہ نمازی اس سورۃ کو پڑھتا ہے تو گویا وہ اپنے رب سے باتیں اور مناجات کرتا ہے ۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رض سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مجھ سے جبرئیلؑ نے آکر کہا کہ اللہ تعالےٰ آپکو سلام کے بعد فرماتا ہے کہ جب بندہ نماز کیلئے میرے سامنے کھڑے ہوکر تکبیر تحریمہ یعنی اللہ اکبر کہتا ہے تو میں اس پردے کو جو میرے اور اسکے درمیان حائل ہوتا ہے اٹھا دیتا ہوں ۔ پھر جب میرا بندہ اَلْحَمْدُ یعنی ہرطرح کی تعریف کہتا ہے تو اللہ تعالےٰ اسکی طرف متوجہ ہوکر فرماتا ہے ۔

اللہ تعالےٰ ۔ اے بندے ! یہ حمد تو کس کیلئے کرتا ہے ؟

بندہ ۔ (کہتا ہے) لِلّٰهِ یعنی میری حمد صرف خدائے تعالےٰ کے واسطے ہے ۔

اللہ تعالےٰ ۔ خدا کون ہے ؟

بندہ ۔ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی تمام عالموں کا پالنے والا ہے ۔

اللہ تعالےٰ ۔ وہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کون ہے ؟

بندہ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یعنی بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے ۔

اللہ تعالےٰ ۔ رحمن ورحیم کون ہے ؟

بندہ - مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ یعنی مالک و حاکم ہے قیامت کے دن کا۔

اللہ تعالےٰ - اے میرے بندے! بلاشبہ میں ہی اس حسرت بھرے دن کا مالک ہوں۔

بندہ - اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یعنی تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ - اے میرے بندے! جب تو خاص میری ہی بندگی کرتا ہے اور مجھ ہی سے مدد چاہتا ہے تو اب دل کھول کر مانگ۔ کیا مانگتا ہے؟ اسوقت تو جو مانگے گا دیا جائیگا اور تیری آرزو پوری کیجائیگی۔

بندہ (کہتا ہے) اِهْدِنَا یعنی ہمکو راستہ بتلا۔

اللہ تعالےٰ - کس راستے کا طالب ہے؟

بندہ - الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی "سیدھے راستہ" کا طالب ہوں۔

اللہ تعالےٰ - کس کی سیدھی راہ چاہتا ہے؟

بندہ - صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی انکا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالےٰ فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ "اے فرشتو! تم گواہ رہو۔ میں نے اپنے اس بندے کو ان لوگوں میں داخل کیا جن پر میں نے انعام کیا ہے اور وہ چار فریق ہیں۔ (۱) گروہ انبیا۔ (۲) گروہ صدیقین (۳) گروہ شہدا (۴) گروہ صلحا۔

پھر بندہ عرض کرتا ہے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ یعنی میں اُن لوگوں کی راہ نہیں طلب کرتا جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں تو اللہ تعالےٰ فرشتوں سے فرماتا ہے کہ "تم گواہ رہو میں نے اپنے اس بندے کو ان نافرمانوں سے علیحدہ کر لیا جن پر میرے غصہ کی آگ بھڑکی اور جو گمراہی میں بتلا ہیں۔ یہ سنتے ہی فرشتے آمین کا نعرہ بلند کرتے ہیں"۔

سورۂ شفا اور **شافیہ** بھی اس سورہ کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں تمام ظاہری و باطنی بیماریوں کی شفا ہے مثلاً اِيَّاكَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) میں اگر ریا و نمود سے شفا حاصل ہوتی ہے تو وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) میں تکبر و نخوت سے رہائی اور خود پسندی کی بیماری سے شفا ملتی ہے۔ اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (بتلا ہمکو راستہ سیدھا) میں گمراہی سے شفا ملتی ہے حدیث شریف ہے کہ "سورۂ فاتحہ ہر بیماری سے شفا دینے والی ہے"۔

سوال ۳۹ - اسکی کیا وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ ہو یا دیگر وظائف ہم پڑھتے ہیں تو اسکا اثر ظاہر نہیں ہوتا؟

جواب - ہر چیز کی تاثیر کیلئے چند شرائط ہوا کرتے ہیں جن پر اس چیز کے اثر کرنے یا نہ کرنیکا دار و مدار ہوا کرتا ہے مثلاً مشک و زعفران کے موثر ہونے کیلئے ان میں خوشبو کا موجود رہنا ضروری ہے اسی طرح کلام الٰہی کے اثر کیلئے اسکے پڑھنے والے کا متقی ہونا ضروری ہے اور جس طرح انکی خوشبو کم ہوتے جانے سے اثر میں بھی اسی تناسب سے کمی آتی ہے اسی طرح تقویٰ میں جسقدر کمی ہوگی اسی مناسبت سے اسکے پڑھے ہوئے

کلامِ الٰہی کے اثر میں بھی ضرور فرق ہوگا۔ جس طرح غلیظ ماحول میں مشک و زعفران رہنے سے ان کا جوہر موثر باقی نہیں رہتا اسی طرح مذبذب اعتقاد، توہمات اور فاسد خیالات میں مبتلا، جھوٹ کے عادی، مالِ حرام سے پرورش پائے ہوئے انسان کی زبان سے نکلا ہوا کلامِ الٰہی بھی اپنا اثر ہرگز نہیں کرتا جب ایسا شخص پڑھتا ہو جسکا اعتقاد سچا، سچ کا عادی، جھوٹ سے عاری، شیطانی خیالات سے دور، اکل حلال پر قائم ہو تو ضرور کلام الٰہی کا اثر ہو کے رہتا ہے چنانچہ ابو سعیدؓ نے جب سانپ کاٹے ہوئے آدمی پر یہی سورۂ فاتحہ پڑھکر دم کردیا تو وہ اچھا ہوگیا جس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تمکو یہ کسطرح معلوم ہوگیا کہ یہ رُقیہ ہے" یعنی پڑھکر پھونکنے کا سورہ۔ علاوہ ازیں ایک صحابیؓ نے اسی سورۂ فاتحہ کو مرگی والے شخص پر پڑھکر پھونکا تھا جس سے وہ اچھا ہوگیا اسی لئے اسکا نام سورۂ رُقیہ بھی ہے۔ کلامِ الٰہی کو ہم پڑھنے کے بعد اگر اثر نہ ہو تو کلامِ الٰہی یا دیگر اوراد کے سچے اور یقینی اثرات پر شک و شبہ کرنے کے بجائے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تاکہ کلامِ الٰہی سے کماحقہ مستفید ہو سکیں۔

کلامِ پاک میں اب بھی ہے دفعِ زہر کی تاثیر
اثر لیکن نہیں وہ پڑھنے والوں کی زبانوں میں
([illegible])

سبع المثانی بھی اس سورہ کا نام ہے اسلئے کہ اللہ تعالٰے اسی کے بارے میں فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۝ یعنی اور ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں جو (نمازیں) دہرائی جاتی ہیں اور قرآنِ عظیم دیا (پ ۱۴ ر ۶) یہاں سبع المثانی سے مراد سورۂ فاتحہ ہے چنانچہ حدیث میں بھی اس سورہ کا نام سبع المثانی بتلایا گیا ہے۔

یہ نام دو لفظوں (۱) سبع (۲) مثانی سے مرکب ہے اسکے نام میں سبع (سات کا عدد) حسب ذیل وجوہ کی بنا پر کہا جاتا ہے (۱) اسمیں سات آیتیں ہیں (۲) کہا جاتا ہے کہ یہ سورۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سات مرتبہ نازل ہوئی (۳) یا یہ کہ اس سورۃ میں تمام حروفِ تہجی موجود ہیں مگر صرف سات ہی حروف یعنی ث۔ ج۔ خ۔ ز۔ ش۔ ظ۔ ف۔ اور اس کے نام میں دوسرا لفظ "مثانی" (بمعنی دوہرے) بھی حسب ذیل وجوہ کی بنا پر کہا جاتا ہے (۱) یہ سورہ نماز کی ہر رکعت میں دہرایا جاتا ہے۔ (۲) بعضوں نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس سورۂ فاتحہ میں بعض کلمات یعنی اِیَّاکَ، صِرَاط، عَلَیْہِمْ دو دو دفعہ آئے ہیں۔ (۳) بعض اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سورۃ دو دفعہ نازل ہوئی ہے ایکبار مکہ معظمہ میں جبکہ نمازیں فرض ہوئیں اور دوسری بار مدینہ طیبہ میں جب قبلہ بدلا گیا۔ (۴) علاوہ ازیں اسکو مثانی کہنے کی ایک وجہ یہ بھی کہی گئی ہے کہ اس سورہ کے دو حصے کئے گئے ہیں چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ "میں نے نماز (سورۂ فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا ہے۔" وہ اسطرح کہ ابتدائی تین آیتیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ③ (یعنی سب تعریف اللہ تعالےٰ ہی کے واسطے ہے۔ جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے ① بڑا مہربان نہایت رحم والا ② مالک ہے بدلہ کے دن کا ③) خاص اللہ تعالےٰ ہی کیلئے ہے اور وسطی یعنی چوتھی آیت اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④ (یعنی تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں۔) خدا تعالےٰ اور بندے کے درمیان مشترک ہے۔ اسکے بعد ما بقی تین آیتیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑤ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ⑥ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ ⑦ (یعنی بتلا ہم کو راستہ سیدھا) ⑤ راستہ اُنکا جن پر تو نے انعام کیا ⑥ نہ انکا جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور نہ انکا جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں ⑦ صرف بندے ہی کے لیئے ہیں۔

سوال ۴۰۔ قرآن مجید کے اندر سورتوں کے نام لکھے جانے کا طریقہ کس نے رائج کیا؟

جواب۔ حجاج نے ورنہ صحابۂ کرامؓ نے مصاحف میں سورتوں کے نام نہیں لکھے تھے۔ انکو قرآن مجید میں لکھنے کی ایجاد حجاج نے کی ہے۔

سوال ۴۱۔ یہ سورۃ الفاتحہ کہاں نازل ہوئی؟

جواب۔ مکہ میں نازل ہوئی اور ایک روایت کے لحاظ سے دوسرے بار مدینہ میں بھی نازل ہوئی جیسا کہ اوپر بیان ہوا لیکن پہلے مکہ میں نازل ہوئی اس لئے اس سورۃ کو مکی کہتے ہیں۔

سوال ۴۲۔ قرآن مجید کی سورتوں یا آیات کو مکی یا مدنی کس بنا پر کہا جاتا ہے؟

جواب۔ ایسی آیات کو مکی کہا جاتا ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہوں اور جو آیات قرآنی مدینہ میں نازل ہوئیں انہیں مدنی کہتے ہیں۔

سوال ۴۳۔ تو پھر ایسی آیات اور سورتوں کو بھی مکی یا مدنی کیوں کہا جاتا ہے جو ایسے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں جبکہ آپ نہ مکہ میں تھے نہ مدینہ میں بلکہ بحالت سفر یا دیگر مقام پر جہاد وغیرہ کے سلسلہ میں تشریف فرما تھے۔

جواب۔ چونکہ اس کیلئے اکثر مفسرینؒ نے یہ عام اصطلاح بنالی ہے کہ "قرآن مجید کا وہ حصہ جو ہجرت سے پہلے کسی جگہ بھی نازل ہوا ہو مکی ہے اور جو ہجرت کے بعد کسی جگہ بھی نازل ہوا ہو وہ مدنی ہے"۔ اسلئے آیات اور سورتوں کو یا مکی کہا جاتا ہے یا مدنی اسکے سوا کسی اور مقام سے موسوم نہیں کیا جاتا۔

سوال ۴۴۔ قرآن مجید کی ابتدا میں کس کا نام پوشیدہ ہے؟

جواب۔ ہمارے رسول مقبول حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک۔ جیسا کہ حضرت والد ماجد فاضل مدظلہ نے اس بلیغ نکتہ کو اپنے اس شعر میں ظاہر فرمایا ہے۔ ؎

کلام اللہ کی بھی ابتدا ہے نام سے تیرے
کہ ہے اَلْحَمْد کے کلمے میں کامل لفظ احمدؐ کا

چنانچہ کسی ردوبدل کے بغیر الحمد سے ایک لام کو حذف کر دیا جائے تو احمد نمایاں ہو جاتا ہے۔

شبہہ ۱:-
اگر یہ کہا جائے کہ قرآنِ مجید میں اَلْحَمْدُ سے پہلے جب بِسْمِ اللّٰہ ہے تو قرآنِ مجید کو کس طرح اَلْحَمْدُ سے شروع کہا جا سکتا ہے؟ تو اس کا

جواب
یہ ہے کہ اَلْحَمْدُ سے پہلے جو بِسْمِ اللّٰہ ہے اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں اختلاف ہے جیسا کہ سوال نمبر ۳۴ میں لکھا جا چکا ہے لیکن الحمد سے کلام اللہ کا شروع ہونا بلا اختلاف مسلّم ہے۔ لہٰذا قرآنِ مجید کو الحمد سے شروع ہے کہنا بھی غلط نہیں جس میں حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی پوشیدہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک سے اپنا یہ کلام شروع فرمایا ہے۔ اللہ اللہ کیا شانِ محمدی ہے!! صلی اللہ علیہ وسلم۔

سوال ۴۵۔ سورۂ فاتحہ کی وہ خصوصیات بتائیے جو اسکے سوا کسی دوسرے سورہ میں نہیں ہیں؟

جواب۔ (۱) اس سورہ فاتحہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "اسکا نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندہ کیلئے۔ اسکے سوا کوئی سورہ ایسا نہیں جسکے دو حصے اللہ تعالیٰ نے کئے ہوں۔ (۲) قرآنِ مجید میں یہی ایک ایسا سورہ ہے جس کے نام سب سے زیادہ ہیں (۳) یہی ایک سورہ ہے جو سب سے زیادہ مرتبہ پڑھا جاتا ہے کیونکہ ہر نمازی پنجوقتہ نمازوں وغیرہ میں اسے ضرور پڑھتا ہے۔ (۴) نماز کی ہر رکعت میں پورے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے لیکن دوسرے سورتوں کی چند آیتیں بھی ہر رکعت میں پڑھی جا سکتی ہیں (۵) صرف یہ سورۂ فاتحہ ہی ایسا سورہ ہے جو قرآنِ مجید کے تیس پاروں میں سے کسی پارہ میں شامل نہیں ہے کیونکہ پہلا پارہ الم سے شروع ہوتا ہے نہ کہ الحمد سے مگر یہ سورہ جزوِ قرآن ہے (۶) یہی سورہ ہے جو سب سے پہلے لوحِ محفوظ پر لکھا گیا (۷) اسکے سوا کوئی سالم سورہ دوبارہ نازل نہیں ہوا (۸) یہی وہ سورہ ہے جو مکی ہے اور مدنی بھی کہلا سکتا ہے۔ (۹) اسکو نماز میں سب سے پہلے پڑھا جاتا ہے لیکن کسی دوسرے سورہ سے نماز نہیں شروع ہوتی (۱۰) قرآنِ مجید بھی اسی سورہ سے شروع ہوتا ہے اس سے پہلے کوئی سورہ نہیں (۱۱) اس سورہ میں جن صفات الٰہی کا ذکر ہے ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت مناسبت پائی جاتی ہے۔ گویا یہ سورہ صفات الٰہی کے ضمن میں صفات سید المرسلینؐ کو بھی عیاں کر رہا ہے۔ وہ اسطرح کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ میں سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہے تو خود اَلْحَمْدُ میں نام احمدؐ پوشیدہ ہے۔ نیز محمدؐ کے لفظ میں بھی خود تعریف موجود ہے۔ کیونکہ محمدؐ کے معنی سراپا گیا اور تعریف کئے گئے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رب العلمین (تمام عالموں کا پالنے والا) ہے تو ہمارے رسول بھی رحمۃ للعلمین (تمام عالموں کے واسطے رحمت) ہیں۔ اللہ تعالیٰ

رَحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (بہت مہربان نہایت رحم کرنیوالا) ہے تو حضورؐ بھی بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں) اگر اللہ تعالےٰ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہے تو ہمارے نبیؐ بھی شافع محشر ہیں کیونکہ آپکو مقام محمود عطا کیا گیا ہے جس سے مراد مقام شفاعت ہے۔ اِھْدِنَا (ہماری ہدایت کر) سے اللہ تعالےٰ کا ہادی ہونا معلوم ہوتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی ہدایت کی طرف بلانے والے ہیں جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے آپکے بارے میں فرمایا ہے دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ (یعنی اللہ تعالےٰ کی طرف اسکے حکم سے بلانے والے ہیں) (پ ۲۲ ر ۳)۔

سوال ۴۶۔ اس سورۂ فاتحہ میں کتنے حروف اور کتنے کلمے ہیں اور کتنی آیتیں ہیں؟

جواب۔ اس میں (۱۲۶) یا (۱۱۳) حروف ہیں (۲۵) کلمات ہیں اور سات آیتیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

اَلْ[1]۔ سب۔ تمام۔ حَمْد۔ تعریف۔ اَلْحَمْدُ کے معنی سب تعریف۔ لِ۔ واسطے۔ یہ زیر والا لام عربی میں بہت سے معنی کیلئے استعمال ہوتا ہے منجملہ ان کے ملک واختصاص (لیاقت) کے معنی پر بھی دلالت کرتا ہے اللّٰہ ذات باری تعالےٰ کا خاص نام۔ لِلّٰہِ کے معنی اللہ تعالےٰ سب کا مالک ہے اور ہر قسم کی تعریف کے لائق ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے معنے ہوئے حمد کی تمام قسمیں اور سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے۔

سوال ۴۷۔ حمد کے تقریباً ہم معنی الفاظ مدح اور شکر بھی ہیں۔ کیونکہ نعمت کے عطا ہونے پر حمد بھی ہوتی ہے اور مدح بھی اور شکر بھی کیا جاتا ہے

---

[1] الف لام کی عربی میں کئی قسمیں ہیں منجملہ انکے ایک الف لام تعریف بھی ہے جو نکرہ کو معرفہ بنا دیتا ہے مثلاً کِتَابٌ کسی ایک کتاب کو کہتے ہیں مگر جب اَلْکِتَابُ کہا جاتا ہے تو اس سے ایک مخصوص کتاب مراد لیجاتی ہے۔ اس الف لام کو صرف لام تعریف بھی کہتے ہیں جو چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر اس الف لام کو اسلئے لایا جائے کہ اس سے کوئی ایسا شخص خاص مراد لیا جاتا ہو جسے کہنے والا اور سننے والا دونوں پہلے سے جانتے ہوں جیسے اَلرَّجُلُ یعنی وہ مرد تو اس کو لامِ عہد خارجی کہتے ہیں۔ اور اگر ماہیت مراد ہو تو جب افراد کے تحقق کا لحاظ کئے بغیر صرف ماہیت بتلانے الف لام لایا جائے جیسے الرجل خیر من المراۃ یعنی مرد کی ماہیت عورت سے بہتر ہے تو اس میں الرجلُ کہنے سے جنس مرد کہنا مراد ہے اسلئے یہاں رجل پر کا الف لام جنسی لام کہلاتا ہے۔ اور اگر وہ ماہیت افراد میں متحقق ہونیکے لحاظ سے ہے تو پھر کل افراد مراد ہونگے یا بعض افراد غیر معین۔ پس جس الف لام سے کل افراد مراد لئے جائیں اسے لامِ استغراق کہتے ہیں جیسے یہاں اَلْحَمْدُ میں حمد کے کل افراد میں خواہ کسی کی بھی حمد کیجائے انجام کار سب دراصل خدا تعالےٰ ہی کی حمد ہے کیونکہ جو بھی حمد کے قابل ہوتا ہے وہ اللہ تعالےٰ ہی کے دئے ہوئے کمال کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ اسکے۔ بقیہ مضمون صـ۲۸ پر

گر بتائیے کہ ان میں کیا فرق ہے؟

جواب۔ ان میں جو لطیف فرق ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) **حمد**۔ اس تعریف کو کہتے ہیں جو کسی کے عمدہ اور اختیاری فعل پر کیجاتی ہے جیسے علم و سخاوت

مدح۔ اس تعریف کو کہتے ہیں جو کسی کے عمدہ اور اختیاری فعل کے علاوہ غیر اختیاری چیز پر بھی کیجائے جیسے خوبصورتی وغیرہ۔

(۲) **حمد**۔ اس تعریف کو کہتے ہیں جو کسی کے عمدہ صفات واقعی پر کیجائے۔

مدح۔ اس تعریف کو کہتے ہیں جو کسی کے عمدہ اور واقعی صفات سے زیادہ کیجائے۔

(۳) **حمد**۔ زندہ اور مختار کی تعریف کو کہتے ہیں

مدح۔ زندہ اور مختار کے علاوہ مردہ اور غیر مختار کی تعریف کو بھی کہتے ہیں۔

(۴) **حمد**۔ احسان کے بعد ہی ہوتی ہے۔

مدح۔ احسان سے پہلے ہوتی ہے اور کبھی احسان کے بعد بھی۔

(۵) **حمد**۔ صاحب عقل کیلئے کیجاتی ہے۔

مدح۔ بے عقل و بے جان چیز کی تعریف کو کہتے ہیں جیسے کسی نے جانور یا موتی کی تعریف کردی تو اسے حمد نہیں بلکہ مدح کہیں گے۔

(۶) **حمد**۔ ہر طرح اور ہمیشہ درست ہے اور جائز ہے۔

مدح۔ کبھی ممنوع ہے[۱]۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ "خوشامدیوں اور جھوٹی مدح کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈالو"۔

(۷) **حمد**۔ نعمت پر اور نعمت کے بغیر بھی ہوتی ہے۔

شکر۔ بغیر نعمت کے نہیں ہوتا اور اسی تعریف کو شکر کہتے ہیں جو نعمتوں کے مقابل میں ہو۔

(۸) **حمد**۔ صرف زبان سے ہو سکتی ہے۔

شکر۔ کبھی زبان سے ہوتا ہے کبھی دل اور دیگر اعضا و جوارح سے بھی صادر ہو سکتا ہے۔ یعنی قول و عمل و نیت و اعتقاد سے بھی شکر ہو جاتا ہے وہ اسطرح کہ خواہ زبان سے تعریف کردیجائے یا کوئی تعظیم کا کام کردیا جائے یا دل ہی میں خوشنودی پیدا کیجائے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالٰے نے فرمایا ہے

۱؎ بعض احادیث سے مدح کی اباحت بھی ثابت ہوتی ہے تو اسکی تطبیق یہ ہے کہ ایسے شخص کی مدح کیجا سکتی ہے جو نفس کشی پر پوری قدرت رکھتا ہے اور کسی کی مدح سرائی سے دھوکے میں نہیں آتا اور نہ اسکے مزاج میں کوئی تغیر پیدا ہوتا ہے بخلاف اسکے اگر ان باتوں کا اسپر اندیشہ ہو تو ایسے کی مدح کرنا یقیناً مکروہ اور بہت ناپسند ہے ۱۲

بقیہ مضمون صفحہ ۱: ذاتی کمال کی وجہ سے اسلئے سب کی تعریفیں درحقیقت اللہ تعالٰے ہی کی تعریفیں ہے کیونکہ وہی سب کا خالق ہے۔ اور جب الف لام سے بعض افراد غیر معین مراد ہوں تو اسکو لام عہد ذہنی کہتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے نوکر کو کہے اعط الرجل یعنی کسی مرد کو یہ (صدقہ) دیدے۔ تو یہاں اس الف لام سے یہ مراد اور مفہوم نکلتا ہے کہ یہ صدقہ دینے کیلئے کسی کی خصوصیت نہیں بلکہ جو بھی مرد ملجائے اسے یہ صدقہ دیدے ۱۲

اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا (یعنی اے داودؑ کے خاندان والو تم سب شکریہ میں نیک کام کیا کرو (پ ۲۲ ع ۸)۔

سوال ۴۸۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے بجائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے نام مثلاً غفور وغیرہ کے ساتھ یعنی اَلْحَمْدُ لِلْغَفُوْرِ۔ یا۔ لِلْعَلِیْمِ وغیرہ کیوں نہیں لکھا گیا اور اَلْحَمْدُ کے ساتھ اللہ ہی کا لفظ لانے میں کیا نکتہ ہے؟

جواب۔ چونکہ اَلْحَمْدُ کہہ کر سب تعریف خدا تعالیٰ ہی کیلئے بیان کیجا رہی ہے جو ایک جامع تعریف ہے اسلئے اسکے ساتھ خدا تعالیٰ کا ایسا نام لانا ضروری تھا جو اس جامع تعریف کے ساتھ جامع حیثیت رکھتا ہو۔ اور وہ نام "اللہ" ہے کیونکہ یہ ایسی ذات پر دلالت کرتا ہے جو تمام صفاتِ الٰہیہ کا جامع اور کل خوبیوں سے موصوف ہو اور غیر خدا کیلئے نہ حقیقتاً کہا جائے نہ مجازاً۔ اسکے سوائے تمام اسمائے حسنیٰ میں یہ جامعیت و خصوصیت نہیں ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک اسم ایک ایک خاص صفت الٰہی پر دلالت کرتا ہے مثلاً غفور صرف بخشش پر۔ علیم صرف علم پر۔ نیز انکا اطلاق غیر خدا پر بھی ہوتا ہے الحاصل کوئی اسم الٰہی سوائے اللہ کے ایسا نہیں ہے جو اَلْحَمْدُ کے ساتھ اس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو۔

سوال ۴۹۔ بجائے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے اَلْمَدْحُ لِلّٰہِ یا اَلشُّکْرُ لِلّٰہِ کیوں نہیں فرمایا گیا؟

جواب۔ چونکہ مدح غیر مختار اور مردہ کی بھی ہو سکتی ہے مثلاً زیور کی تعریف کو بھی مدح کہتے ہیں جو جاندار نہیں اور غیر مختار ہے اسلئے اَلْمَدْحُ لِلّٰہِ کہنا اللہ تعالیٰ کے زندہ اور مختار ہونے پر دلالت نہ کرتا اور اللہ تعالیٰ تو زندہ ہے اور اسکے تمام کمالات اختیاری ہیں۔ لہذا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فرمایا کیونکہ حمد زندہ کی تعریف ہی کو کہتے ہیں اور اختیاری کمالات پر کیجاتی ہے۔ اگر اَلشُّکْرُ لِلّٰہِ فرمایا جاتا تو اسلئے مناسب نہ تھا کہ شکر خاص انہی نعمتوں پر ہوا کرتا ہے جو صرف بندوں ہی پر ہوتی ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کے کمالاتِ ذاتیہ کی تعریف کا کوئی پہلو نہ رہتا۔ بخلاف اسکے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں خدا تعالیٰ کی تعریف ان نعمتوں کی وجہ سے کیجانا ثابت ہوتا ہے جو بندوں کے علاوہ دیگر مخلوقات پر بھی ہیں۔ یعنی حمد انسان اور دیگر تمام مخلوقات کو کو شامل ہے۔ گویا حمد شکر سے عام ہے۔ علاوہ ازیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنے سے خدا تعالیٰ کے وجود کا اقرار بھی ثابت ہو جاتا ہے وہ اسطرح کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف وہی کرتا ہے جو اسکی صفات کمالیہ کا اقرار کرنے والا ہوتا ہے۔

سوال ۵۰۔ جب سورۂ فاتحہ بندوں کی تعلیم کیلئے یہ تبلانے نازل ہوا ہے کہ بندے اپنے پروردگار سے مناجات میں اسطرح کہا کریں تو پھر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے پہلے قُوْلُوْا (یعنی کہو سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے) کیوں نہ کہا گیا؟

جواب۔ اگر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے پہلے قُوْلُوْا (یعنی کہو) ہوتا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنے کا حکم ہوجاتا اور جب بندے اسکی تعمیل نہ کرتے تو عتابِ الٰہی کے مستحق ہوتے اسلئے اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمتِ عامہ سے بندوں کو حمد کرنیکا صریح حکم نہیں دیا۔

سوال ۱۵۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کی جگہ بندہ کا اَحْمَدُ اللّٰہَ (یعنی میں اللہ تعالےٰ کی تعریف کرتا ہوں) کہنا زیادہ موزوں تھا پھر کیوں نہ کہا گیا؟

جواب۔ اسکی پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر اَحْمَدُ اللّٰہَ (میں اللہ تعالےٰ کی تعریف کرتا ہوں) کہا جاتا تو اس بات کا خیال ہوسکتا تھا کہ بندہ بطور دعوے کے کہتاہے کہ "میں حمد کرتا ہوں" حالانکہ انسان تو کیا تمام مخلوق میں سے کسی کی یہ قدرت نہیں کہ کما حقہٗ اللہ تعالےٰ کی حمد کرسکے۔ اسلئے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریف اللہ تعالےٰ کیلئے ہے) فرمایا گیا کیونکہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنے کے یہ معنی ہونگے کہ وہ تمام تعریفیں جو حمد کرنے والوں نے کی ہیں یا نہیں کی ہیں اور وہ بھی کہ جنکا وجود عقل میں آسکتا ہے سب کی سب اللہ تعالےٰ کیلئے سزاوار ہیں۔ اور اسکے ضمن میں وہ سب تعریفیں بھی آگئیں جو انبیاء اور فرشتے اور دیگر تمام مخلوقات نے کی ہیں اور جو ہونے والی ہیں جنکی کوئی انتہا ہی نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی نعمت پر بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتاہے تو اللہ تعالےٰ فرشتوں سے مخاطب ہوکر فرماتاہے کہ "میرے بندے کو دیکھو میں نے اسکو معمولی نعمت عطا کی اور اس نے میری بارگاہ میں بے بہا تحفہ پیش کیا۔

شبہہ:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا نعمتِ الٰہی سے کسطرح افضل ہوسکتاہے حالانکہ بندے کے تحفہ سے خدائی عطیہ زیادہ عظمت والا ہونا چاہیئے؟ **جواب۔** چونکہ حمد کرنے سے جو ثواب بندہ کو ملتاہے وہ اس نعمت سے افضل ہوتاہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے بندہ کو عطا ہوئی ہے۔

نعمتم دادی و دادی بعد ازاں توفیق حمد
شکر نعمت بعد نعمت نعمتے باشد عظیم

اور جب بندہ کسی نعمت پر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتاہے تو اسلیئے بھی یہ حمد افضل ہے کہ دنیا کی نعمت فنا ہونے والی ہے اور حمد کہنے کا ثواب دائمی ہے اور دائمی چیز فانی چیز سے افضل ہوا کرتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بندہ جب اَحْمَدُ لِلّٰہِ کہتا تو اس سے یہ خیال بھی ہوسکتا تھا کہ اس بندے ہی نے اللہ تعالےٰ کی تعریف کی ہے ورنہ اللہ تعالےٰ اس حمد بیان کرنے سے پیشتر محمود نہ تھا اسکے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریف اللہ تعالےٰ ہی کیلئے ہے) کہنے سے یہ صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ حمد کرنے والوں کی حمد صادر ہونے سے پیشتر ہی ازل سے محمود ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر اَحْمَدُ اللّٰہَ (میں اللہ تعالےٰ کی تعریف کرتا ہوں) کہتا تو اسکے یہ معنی ہوتے کہ "میں دل سے تیری تعریف کرتا ہوں" جو اکثر اوقات

میں غلط ہو جاتا۔ کیونکہ عموماً ایسے موقعوں پر بندے کا دل اللہ تعالےٰ کی تعظیم اور حمد و ثنا سے غافل ہوا کرتا ہے اور صرف عادتی طور پر ان الفاظ کو اپنی زبان سے کہدیا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اسکا یہ قول جھوٹا ہونا لازم آتا۔ لیکن اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (یعنی سب تعریف اللہ تعالےٰ ہی کے لئے ہے) کہنا ہر حالت میں سچ ہی ہوتا ہے خواہ اسے غفلت ہی کی حالت میں کیوں نہ کہے۔ اس لطیف فرق کو اس مثال سے سمجھا جاتا ہے کہ جب ہم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) کہتے ہیں تو اُسوقت چاہے ہمارا دل غافل ہی کیوں نہ رہے مگر جھوٹ کا کوئی پہلو نہیں رہتا۔ بخلاف اسکے جب بحالت غفلت اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) کہتے ہیں تو دل کا ارادہ اس میں شامل نہ ہونیسے ہمارا اَشْھَدُ (میں گواہی دیتا ہوں) کہنا جھوٹ قرار پاتا ہے اسی طرح اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ (میں اللہ تعالےٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں) کہنا اسی حالت میں درست ہوتا ہے جبکہ حضور قلب اور دلی ارادہ بھی اسکے ساتھ شامل ہو ورنہ جھوٹ ہوتا ہے اسلئے بجلئے اسکے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ (اے اللہ مجھے بخشدے) کہنا درست ہوتا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اگر اَحْمَدُ اللّٰہ کہا جاتا تو معنوی اعتبار سے یہ مطلب ہوتا کہ میں حال و مستقبل کی نعمتوں کا شکر کرتا ہوں اور اسکی بنا پر اللہ تعالےٰ کی تعریف کرتا ہوں اور اس میں ماضی کی نعمتوں کے شکر کا پہلو نہ رہتا۔ مگر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں ماضی کی نعمتوں کے شکر کا بھی مفہوم ہے۔

سوال ۵۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مَنْ لَّمْ یَحْمَدِ النَّاسَ لَمْ یَحْمَدِ اللّٰہَ (یعنی جس نے لوگوں کی تعریف نہ کی اس نے خدا تعالےٰ کی حمد نہ کی) تو اس سے معلوم ہوا کہ حمد کے قابل اللہ تعالےٰ کے سوا اور لوگ بھی ہوتے ہیں مثلاً ماں باپ۔ استاد، مرشد وغیرہ تو پھر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (یعنی سب تعریف اللہ تعالےٰ ہی کیلئے ہے) کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

جواب۔ ماں باپ ہوں چاہے استاد و مرشد وغیرہ سب کی تعریف کرنا درحقیقت اللہ تعالےٰ ہی کی حمد ہے کیونکہ جس صفت کی بنا پر کسی کی تعریف کیجاتی ہے وہ درحقیقت اسکی ذاتی نہیں ہوتی بلکہ وہ قابلِ تعریف صفت اللہ تعالےٰ ہی کی طرف سے اس میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ماں باپ کی تعریف اولاد سے محبت کرنے کی بنا پر ہو تو یہ محبت ماں باپ کے دل میں اللہ تعالےٰ ہی نے پیدا کی ہے کیونکہ دوست بنانا اللہ تعالےٰ ہی کا کام ہے قرآن مجید میں ہے وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (یعنی اور تم پر جو اللہ تعالےٰ کا انعام ہے اسکو یاد کرو جب کہ تم

دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالدی تو اللہ تعالیٰ کے انعام سے تم آپس میں بھائی بھائی ہوگئے (پ ۴ ر ۲) الغرض جو بھلائی یا نعمت ہمکو پہنچتی ہے وہ ضرور کسی واسطہ سے یا واسطہ کے بغیر اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی ہوتی ہے چنانچہ قرآنِ مجید میں ہے وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (یعنی تم کو جو بھی نعمت ملی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کیطرف سے ہے) (پ...) پس ہر ایماندار کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ جو نعمت اسے حاصل ہوتی ہے خواہ وہ کسی بندے کے ذریعہ ہی سے کیوں نہ پہنچے لیکن اسکا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے اسلئے وہی سب تعریفوں کا سزاوار ہے مگر اسکے یہ معنی بھی نہیں کہ خدا تعالیٰ جسکے واسطہ (مثلاً ماں باپ، استاد، مرشد وغیرہ) سے ہمکو نعمت عطا فرماتا ہے اسکا شکر اور تعریف بالکل نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ط (کہ تو میرا اور اپنے ماں باپ کی شکرگزاری کیا کر (پ ۲۱ ر ۱۱) اس میں اپنے شکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے شکر کا حکم دیا ہے جس سے محسن کی شکرگزاری کے ساتھ ساتھ فاعلِ حقیقی کو نہ بھولنے اور اس کا شکر کرنے کی طرف بھی لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔ الحاصل مخلوق کی تعریف گویا خالق کی تعریف ہے اسلئے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے سب تعریف کہنا بالکل صحیح ہے۔

سوال ۵۳۔ کونسا کلمہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کا شکر بھی موجود ہے؟

جواب۔ وہ کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ہے جسے حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا ہے کہ اُسکے سوا ایسا جامع کلمہ جس میں ذکر اور شکر بھی ہو کوئی نہیں ہے"۔ اور حمد خاص اللہ تعالیٰ ہی کیلئے لائق ہے دوسرے کو زیبا نہیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهٗ"۔

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①

رَبّ۔ پالنے والا۔ پرورش اور تربیت کرنے والا اور پیدا کرنا کسی چیز کو پھر اسے بتدریج مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے موافق اسطرح نشوونما دینے والا کہ وہ چیز اپنے حدِ کمال تک پہنچ جائے علاوہ ازیں اس لفظ رَبّ کا اطلاق اصلاح کے لئے تصرف کرنے والے اور سردار پر بھی ہوتا ہے اسلئے رَبّ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو کہا جاسکتا ہے عَالَمِیْن جمع ہے عالَم کی یعنی بہت سے عالَم اور یہ لفظ عالم بھی جمع ہی ہے جس کا لفظاً کوئی واحد بھی نہیں ہے۔ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی "پالنے والا تمام عالموں کا"۔ پوری آیۃ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ① کے معنے ہوئے سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے جو سب عالموں کا پالنے والا ہے۔

سوال ۵۴۔ رَبّ کا لفظ غیر خدا کے لئے کس صورت میں استعمال ہو سکتا ہے؟

جواب - اضافت کے ساتھ ہو تو رَب کا لفظ غیر خدا کیلئے بھی کہا جا سکتا ہے جیسے رَبُّ الْفَرَسِ گھوڑے کا مالک - قرآن مجید میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس قیدی سے جسکی رہائی کا گمان تھا کہا اُذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ (یعنی اپنے آقا (بادشاہ) کے سامنے میرا بھی تذکرہ کرنا (پ۱۲ ع۱۵) -

سوال ۵۵ - عَالَم کو عَالَم کیوں کہتے ہیں ؟

جواب - عالَم کو اگر علامت سے مشتق مانا جائے تو مخلوق کو عالَم اسلئے کہتے ہیں کہ یہ مخلوق اپنے خالق کے وجود کی علامت ہے اور اگر عالَم کو علم سے مشتق کہا جائے تو عالَم سے وہ چیز مراد ہوگی جس سے کسی دوسری چیز کا علم حاصل ہو - چونکہ اس عالَم (مخلوق) سے خالق کا علم حاصل ہوتا ہے لہذا مخلوق کو عالَم کہا گیا

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقِ دفتریست معرفتِ کردگار

سوال ۵۶ - عالَم کسے کہتے ہیں ؟

جواب - خدا تعالےٰ کی ذات وصفات کے سوا ہر موجود و مخلوق کو خواہ وہ ذات[۱] ہو یا صفات[۲] عالَم کا لفظ شامل ہے - پھر اس عالَم کے بیشمار اقسام بیان کئے جاتے ہیں (۱) عالَم مجردات وہ ہے جو جسم و جرم سے بری اور اپنی لطافت کیوجہ ہمکو نظر نہیں آتے جیسے فرشتے اور ارواح (۲) عالَم جسمانیات پھر عالَم علویات جیسے آسمان تارے وغیرہ (۳) عالَمِ سفلیات میں بھی بعض اپنی لطافت کے سبب ہمکو نظر نہیں آتے جیسے ہَوا - جنات وغیرہ اور بعض ایسے ہیں جو نظر آتے ہیں جیسے مٹی وغیرہ پھر ان میں متعدد اقسام ہیں یعنی عالَم جمادات - عالَم نباتات - عالَمِ حیوانات جن میں سے ہر ایک بہت سے عالموں پر مشتمل ہے اور اور ان سب میں عالَمِ انسان مُشترف ہے - بعض نے کہا ہے کہ ہر زمانہ کے لوگ عالَم کہلاتے ہیں بعض کا قول ہے کہ اس آیتہ میں عالَم سے مراد صرف انسان ہے کیونکہ عالَم میں جسقدر چیزیں موجود ہیں ان سب کی نظیر ہر انسان میں پائی جاتی ہے اسلئے انسان کو عالَم اصغر بھی کہا جاتا ہے - چنانچہ رحم مادر میں جنین کی حرکتیں ستاروں جیسی ہوتی ہیں اسکی ولادت تاروں کے طلوع کے مشابہہ اسکی موت تاروں کے غروب ہونے کی طرح - یہ تو عالَمِ علوی سے انسان کی مشابہت ہوی - اب عالَمِ سفلی سے انسان کی مشابہت اسطرح پر ہے کہ انسان کا سر گویا آسمان ہے اور بدن زمین جیسا ہڈی کے سرے پہاڑ کیطرح گودا مختلف کانوں (معادن) کے مانند اس کے بدن کی رگیں نہروں جیسی اسکا گوشت گویا مٹی - بال زمین کی روئیدگی کے مانند ہیں اسکا مُنہ مشرق پیٹھ مغرب دایاں جنوب اور بایاں شمال کے مانند ہے

---

[۱] ذات اسکو کہتے ہیں جو اپنے وجود میں غیر کی محتاج نہو جیسے زمین و آسمان - اسی کو جوہر بھی کہتے ہیں -

[۲] صفت وہ ہے جو اپنے وجود میں غیر کی محتاج ہو جیسے رنگ ، بو ، وغیرہ کیونکہ رنگ اسیوقت ظاہر ہو سکتا ہے جبکہ اس کا ظرف یا جسم ہو جیسے دیوار کاغذ وغیرہ اسلئے اسی کو عرض بھی کہتے ہیں -

اسکی سانس ہوا جیسی اسکی گفتگو گرج کے مشابہہ
ہنسنا بجلی کی چمک اسکا رونا بارش اسکا غصہ
ابر اسکا پسینہ پانی کی رَو اسکی نیند موت اسکی
بیداری زندگی کے مانند۔ اسکے بچپن کا زمانہ
موسم بہار کیطرح اسکی جوانی اور ایام شباب
گرمی کے موسم کے مانند اسکی کہولت یعنی ادھیڑپن
موسم خریف کے جیسا اسکا بوڑھاپن موسم سرما
کے مشابہہ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ
(پس کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو بہتر ہے تمام
پیدا کرنے (بنانے) والوں سے (پ ۱۸ ر ۱) اور جسطرح
عالم کبیر (بڑے عالم) سے صانع عالم کا علم ہوتا
ہے۔ اسی طرح ہر انسان سے بھی خالقِ عالم کا
علم حاصل ہوتا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے
وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (اور خود تمہاری
ذاتیں بھی (یقین دلانے والی بہت سی نشانیاں)
ہیں پس کیا دکھائی نہیں دیتا (پ ۲۶ ر ۱)۔

اور بلحاظ صفات بھی کئی عالم ہیں کسی نے
کہا عالموں کی تعداد اٹھارہ ہزار ہے حضرت
ابوسعید خدری رض فرماتے ہیں کہ چالیس ہزار عالم
ہیں اور تمام دنیا انمیں سے ایک عالم ہے۔ کسی
نے کہا اَسّی ہزار عالم ہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ
عالموں کی گنتی عالم الغیب کے سوا کسی کو معلوم
نہیں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ
رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (یعنی تمہارے رب کے لشکروں کو
اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (پ ۲۹ ر ۱۵) اسلئے
اللہ تعالےٰ نے لفظ عالم جو خود جمع ہے اسکی بھی
جمع عالمین لا کر رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ فرمایا جس سے
یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی طرح طرح کی مخلوق
ہے جسکا وہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ ان کا رب
یعنی پالنے والا بھی ہے جس میں سے کوئی چیز اسکی
تربیت اور پرورش سے خالی نہیں ہے۔

الحاصل جسقدر بھی عالم مانے جائیں انمیں
سے ہر فرد اور ہر جزو ایسا ہے جو خواہ کتنا ہی کمال الا
ہو جائے مگر وہ ہر وقت ضرور اللہ تعالےٰ کا محتاج
رہتا ہے اور جب ہر چیز اللہ تعالےٰ کی محتاج رہی
تو پھر غیر اللہ کی عبادت کسطرح درست ہو سکتی ہے
کیونکہ عبادت کا وہی مستحق ہو سکتا ہے جو کسی کا محتاج
نہ ہو اور غیر اللہ خود اللہ تعالےٰ کے جب محتاج ثابت ہو چکے
تو پھر وہ بذات خود کسی کی حاجت کیسے پوری کر سکتے
ہیں۔ سچ ہے وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ
وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ (اور سب کام اسی کی طرف رجوع
ہونگے پس عبادت کر اسی کی اور اسی پر بھروسہ
رکھ (پ ۱۲ ر ۱۰)۔

سوال ۷۵۔ جبکہ عالم میں بھی جمع کے معنی موجود
ہیں تو رَبِّ الْعَالَمِ کہنے میں کیا قباحت تھی۔

جواب۔ اللہ تعالےٰ کو رَبِّ الْعَالَمِ (عالم کا
پالنے والا) کہنے میں شرک کی نفی اور رب پرستی کی
تردید کما حقہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اسلئے کہ اکثر وبیشتر
مذاہب میں ہر کام (جو بجائے خود ایک عالم کہلاتا
ہے) کا الگ خدا مانا جاتا ہے۔ مثلاً زردشتی اس

بات کے قائل ہیں کہ نیکیوں کا خدا یزدان ہے اور برائیوں کا خدا اہرمن یعنی عالم حسنات اور عالم سیئات کا الگ الگ خدا ہے اسی عقیدے کیطرح جہلائے عرب بھی ہر چیز (عالم) کا ایک الگ حاجت روا بنا کر کعبہ میں سینکڑوں بت بٹھائے تھے اور دنیا میں بیشمار بت اسی نظریہ کے مدنظر وجود میں لائے گئے ہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ کو بھی رَبُّ الْعَالَم یعنی ایک ہی عالم کا رب کہا جاتا تو وہ بھی منجملہ دیگر مذاہب کے خداؤں کے ایک خدا سمجھا جاتا اسلئے اس کے بجائے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (سب عالموں کا پالنے والا) فرما کر خدا کی صحیح تعریف سے آگاہ فرمایا کہ وہی ذات معبود ہو سکتی ہے جو سب عالموں پر پورا پورا اختیار رکھتی ہو ورنہ دنیا کی کسی ایک چیز کی پرورش کیلئے صرف ایک ہی عالم کافی نہیں ہوتا بلکہ کئی عالم اسکی پرورش میں حصہ لیتے ہیں مثال کے طور پر انسانی پرورش کی ایک چیز روٹی ہی کو لیجیے کہ اسکے تیار ہو کر میسر ہونے تک کئی عالم جیسے زمین کی صلاحیت۔ بارش و ہوا کا موافق ہونا۔ آفتاب و مہتاب کے اثرات وغیرہ وغیرہ اس میں حصہ لیتے ہیں پس معلوم ہوا کہ اگر ہر عالم کا ایک الگ رب یا بت یا معبود مانا جائے تو ہر فرد موجود کی ضروریات کی تکمیل کیلئے ایک عالم کے رب کو دوسرے عالم کے رب کا ہمیشہ محتاج ہونا ضروری ہوتا ورنہ موجودات کی کوئی چیز پایہ تکمیل کو نہ پہنچتی۔ اور یہ مسلّم ہے کہ محتاج معبود نہیں ہو سکتا بلکہ عبادت کے لائق رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہے جو سب عالموں کا رب ہے اسلئے سب اسکے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اللہ اللہ مطالب قرآن ایک دریائے ناپیدا کنار ہیں اس میں جسقدر بھی غور کیا جائے وہ کم ہی معلوم ہوتا ہے اسکا ہر پہلو اپنے اندر خاص جاذبیت رکھتا ہے ؎

مخدرات سراپردہائے قرآنی
چہ دلبراند کہ دل می برند پنہانی

اسکی لذت وہی پا سکتا ہے جسے علم نافع و عمل صالح کے ساتھ خلوص کی بھی توفیق حاصل ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ (یعنی جو علم والے ہیں وہی انکو سمجھتے ہیں (پ ۲۵ ر ۱۶) ورنہ اسکی مثال اس مصرع کہ نکتہ داں نشود کرم گر کتاب خورد (یعنی کیڑا کتاب کو کھا لینے سے نکتہ جاننے والا نہیں ہو سکتا) کے مصداق ہے۔

رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کہنے میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالےٰ مکان و زمان اور جہت سے منزہ ہے۔ وہ اس طرح کہ جب عالم میں جیسا کہ بیان کیا گیا اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات کے سوا تمام چیزیں شامل ہیں تو انہی میں مکان۔ زمان۔ جہت بھی آگئے جسکا اللہ تعالےٰ رب اور خالق ہے۔ اور یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کسی چیز کا بنانے والا مثلاً کرسی کا بنانیوالا کرسی سے پہلے موجود ہونا ضروری ہے ورنہ اس چیز کا مثلاً کرسی کا وجود ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کا اپنی مخلوق (جس میں مکان۔ زمان اور جہت

بھی داخل ہیں) سے پہلے ہونا لازمی ہوا۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ خالق عالم مکان و زمان اور جہت سے پاک و منزہ ہے اور اسکا محتاج نہیں کیوں کہ اللہ تعالےٰ اسوقت سے ہے جبکہ نہ مکان تھا نہ زمانہ اور نہ جہت کا وجود ہوا تھا۔

بعض کچے عقیدے کے لوگ اس میں شک کرتے ہیں لہٰذا ایسوں کی تشفی خاطر کیلئے ذیل میں وہ مناظرہ لکھا جاتا ہے جو ایک دہریہ عالم اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ تعالےٰ علیہ کے درمیان خلیفہ عباسی کے سامنے ہوا تھا۔

دہریہ۔ کیا اللہ تعالےٰ ہے اور ہے تو کہاں ہے؟

امام اعظمؒ۔ اللہ تعالےٰ ضرور موجود ہے لیکن اس کیلئے کوئی خاص مکان نہیں۔

دہریہ۔ جب کسی چیز کا وجود ہوتا ہے تو اس کا خاص مکان ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر خدا موجود ہے تو اسکے لئے خاص مقام کیسے نہیں؟

امام اعظمؒ۔ ہر موجود کیلئے خاص مکان کی ضرورت نہیں چنانچہ اسکی دلیل خود تمہارے جسم میں بھی ہے وہ یہ کہ بتاؤ تمہارے جسم میں روح کا وجود ہے یا نہیں۔

دہریہ۔ ہاں روح تو ہر زندہ آدمی کے جسم میں موجود ہے اور یقیناً ہے۔

امام اعظمؒ۔ بتاؤ تمہارے جسم میں روح کس مقام پر ہے؟ سر میں ہے یا پیٹ میں ہاتھ میں ہے یا پاؤں میں۔

دہریہ۔ یہ سنکر لا جواب ہو گیا۔

امام اعظمؒ نے ایک پیالہ میں دودھ منگوایا اور دہریہ سے پوچھا کہ "اس دودھ سے بھرے ہوئے پیالہ میں گھی ہے یا نہیں؟

دہریہ۔ بیشک اس میں گھی موجود ہے۔

امام اعظمؒ۔ جب اس میں گھی موجود ہے تو بتاؤ کہاں ہے؟ اوپر ہے یا درمیان میں یا نیچے۔ یہ سنکر دہریہ لا جواب ہوا تو آپ نے فرمایا کہ "جس طرح جسم میں روح موجود ہونے کے باوجود روح کا کوئی خاص مقام نہیں ہے اور دودھ میں گھی ہونیکے باوجود اسکے لئے بھی کوئی خاص جگہ نہیں بتلائی جا سکتی اسی طرح خدائے قدوس کیلئے اس کائنات میں کوئی خاص مکان نہیں وہ مکان کا محتاج نہیں۔[1]

دہریہ۔ اللہ تعالےٰ سے پہلے کیا تھا اور اس کے بعد کیا ہے؟

امام اعظمؒ۔ اللہ تعالےٰ سے پہلے کچھ تھا نہ بعد میں کچھ ہوگا ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے (پ ۲۷ ر ۱) اور اسکی بھی مثال تمہارے ہی جسم میں موجود ہے وہ یہ کہ بتاؤ تمہارے انگوٹھے

---

[1] جسطرح جسم میں روح اور دودھ میں گھی موجود ہے مگر اس کا کوئی ایک خاص مقام متعین نہونیکے باوجود جسم یا دودھ کے کسی بھی حصہ کو روح یا گھی سے خالی نہیں کہا جا سکتا اسی طرح خدا تعالےٰ اگرچہ کسی خاص مکان میں محدود نہیں لیکن ہر جگہ موجود ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے خواہ تم لوگ کہیں بھی ہو (پ ۲۷ ر ۱)۔

سے پہلے کیا ہے اور چھوٹی انگلی کے بعد کیا ہے ؟

دہریہ۔ انگوٹھے سے پہلے کچھ نہیں وہی پہلا ہے اور چھوٹی انگلی کے بعد بھی کچھ نہیں وہی سب سے آخر ہے۔

امام اعظمؒ۔ جیسا کہ انگوٹھے سے پہلے کچھ نہیں اور چھوٹی انگلی کے بعد بھی کچھ نہیں ویسا ہی اللہ تعالےٰ کے پہلے اور اسکے بعد بھی کوئی شئی نہیں ہے وہی اول ہے اور آخر بھی وہی ہے۔

اس کے علاوہ روم کے بادشاہ کے بھجوائے ہوئے ایک دہریہ عالم نے بھی اسی قسم کے سوالات خلیفہ عباسی کے دربار میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے کئے تھے۔

دہریہ۔ اللہ تعالےٰ سے پہلے کیا تھا ؟

امام اعظمؒ۔ تم بتاؤ کہ ایک (عدد) سے پہلے کیا ہے ؟

دہریہ۔ ایک کا عدد ہی پہلا ہندسہ ہے اس سے پہلے کچھ نہیں۔

امام اعظمؒ۔ جب واحد مجازی جو لفظی ہے اس سے پہلے کچھ نہیں تو واحدِ حقیقی سے پہلے کوئی چیز کیسے ہو سکتی ہے ؟

دہریہ۔ لاجواب ہو کر پھر دوسرا سوال کیا کہ بتلائیے اللہ تعالےٰ کس جہت میں ہے ؟

امام اعظمؒ۔ جب تم شمع روشن کرتے ہو تو اس کی روشنی کس جہت میں ہوتی ہے اور شمع کی لَو کا مُنہ کدھر ہوتا ہے ؟

دہریہ۔ شمع کی لَو کا مُنہ تو کسی خاص سمت کیطرف نہیں ہوتا بلکہ ہر طرف ہوتا ہے اور اسی طرح اسکی روشنی بھی کسی ایک جہت میں نہیں ہوتی بلکہ تمام جہات میں یکساں ہوتی ہے۔

امام اعظمؒ۔ جب مجازی نور کا رُخ کسی خاص سمت کی طرف نہیں ہوا کرتا بلکہ تمام جہات میں یکساں ہوا کرتا ہے تو پھر زمین و آسمان کے نورؔ اور اور اس کے پیدا کرنیوالے اور ہمیشہ رہنے والے کیلئے بھی کوئی خاص جہت ہرگز نہیںؔ ہو سکتی۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک بڑے دہریہ نے خلیفہ عباسی کے دربار میں آکر کہا کہ آپکے کسی بڑے عالم سے میں مناظرہ چاہتا ہوں جسمیں یہ ثابت کرونگا کہ اللہ کا وجود نہیں بلکہ یہ تمام کائنات یوں ہی از خود پیدا ہوئی ہے اور از خود ہی چل رہی ہے"۔ خلیفہ کی نظرِ انتخاب حضرتؒ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

لہ چنانچہ قرآن مجید میں ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ تعالےٰ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا (پ ۱۸)۔

لہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (اور اللہ تعالےٰ کے واسطے ہے مشرق بھی اور مغرب بھی (یعنی سب سمتیں اسکی ہیں) کیونکہ تم لوگ جس طرف مُنہ کرو اُدھر (ہی) اللہ تعالےٰ کا رخ ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ (تمام جہات کو) گھیرے ہوئے ہے اور بہت جاننے والا ہے (پ ۱) چنانچہ ہر قوم و ملت کا قبلہ اور جہت عبادت الگ الگ رہی ہے جیسے یہود کا قبلہ مسجدِ اقصیٰ کا صخرہ اور عیسائیوں کا قبلہ بیت اللحم یعنی بیت المقدس کا مشرقی حصہ اور ہمارا کعبہ ہونا اس امر کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کسی ایک ہی سمت میں محدود نہیں ہے ورنہ ہر ایک کا قبلہ صرف اسی ایک سمت کیطرف مقرر ہوتا جس طرف اللہ تعالےٰ ہوتا۔ بس ثابت ہوا کہ اللہ تعالےٰ مکان و جہت سے پاک اور منزہ ہے ۱۲ (از مولف)۔

پر پڑی اور اس نے آپ کے گھر پر اپنے قاصد کو بھیجا کہ مناظرہ کیلئے دربار میں تشریف لائیں۔ آپ نے شاہی قاصد سے تمام ماجرا سنکر فرمایا کہ "تم جاؤ اور خلیفہ سے کہدو کہ میں آتا ہوں"۔ چنانچہ وہ واپس ہوا اور خلیفہ کو بھرے دربار اطلاع دیدی کہ "حضرت ابو حنیفہؒ آتے ہیں" جس کے بعد بادشاہ اور سب درباری آپ کا بیحد انتظار کرنے لگے۔ بہت دیر کے بعد حضرت امام اعظمؒ دربار میں پہنچے۔ تو اس آئے ہوئے دہریہ عالم نے آگے بڑھکر آپ سے پوچھا کہ :-

دہریہ۔ "خلیفہ کے بلانے کے باوجود آپ نے آنے میں کیوں دیر کی؟"

امام اعظمؒ۔ میرے گھر اور اس محل کے درمیان راستہ میں ندی حائل ہے آنیکے لئے کشتیوں سے پار ہونا پڑتا ہے۔ جب میں یہاں آنے اپنے گھر سے نکلکر ندی کے کنارے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کشتی کے تختے پانی پر الگ الگ بکھرے ہوے پڑے ہیں نہ کشتی ہے نہ کوئی ناخدا۔ یہ دیکھکر میں حیران کھڑا ہو گیا کہ آخر کسطرح اس ندی کو پار کر کے دربار خلافت میں حاضر ہو سکوں۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ یکایک کشتی کے بکھرے ہوئے تختے از خود یکجا ہونے لگے اور خود بخود جڑنے کے بعد کشتی بنگئی پھر بغیر چلانیوالے کے وہ چلنے لگی اور میری طرف آپہنچی جیسے ہی وہ کنارے پر لگی میں اس میں بیٹھ گیا جسکے بعد وہ کشتی بغیر ناخدا کے چلنے لگی اور سیدھی دوسرے کنارے پر آکر ٹھیر گئی تب میں اس میں سے اترا یہاں آگیا۔ ان وجوہ کی وجہ مجھے یہاں پہنچنے میں دیری ہوئی ہے"۔

اس دہریہ نے آپکی یہ گفتگو سنی تو خلیفہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

دہریہ۔ مجھ سے مناظرہ کیلئے ایسے نادان شخص کو آپنے بلایا ہے جو اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ کشتی کے بکھرے تختے بغیر یکجا کرنے والے کے از خود کیسے یکجا ہو سکتے ہیں اور بغیر جوڑنے والے کے کیسے جڑ سکتے ہیں اور کشتی بغیر بنانے والے کے خود بخود کیسے بن سکتی ہے اور بغیر ناخدا کے کشتی کیسے کنارہ پر آئی ہوگی اور کسطرح انکو لیکر از خود چلتی ہوئی دوسرے کنارے پر پہنچی ہوگی۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس دہریہ سے فرمایا کہ :-

امام اعظمؒ۔ "مجھ سے بڑھکر نادان اور بے عقل وہ شخص ہے جو اتنا نہ سمجھے کہ جب ایک معمولی کشتی بغیر بنانے والے کے نہیں بن سکتی بغیر چلانے والے کے نہیں چل سکتی تو پھر یہ تمام کائنات یہ زمین و آسمان یہ چاند اور سورج وغیرہ بغیر بنانے والے کے کیسے بن گئے اور یہ نظام کائنات بغیر چلانیوالے خالق برتر و بزرگ کے کیسے قائم ہے"۔ یہ سنکر دہریہ لاجواب ہو گیا اور اہل دربار آپکے تبحر علمی[1] اور حاضر جوابی سے بیحد متاثر ہوئے۔

بیشک ایک خدا کے وجود اور اسکی شان ربوبیت کو

---

[1] بعض ایسے حضرات جنھیں خواہ مخواہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے خاص عناد ہوتا ہے انکے دلوں میں۔ بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲ پر

نمایاں کرنے والی نظامِ عالم کی وہ یکسانیت بھی ہے جس میں ایک ہی قاعدے کی ایسی پابندی پائی جاتی ہے جو کائنات کے ہر حصہ میں ابتدا سے موجود ہے اور کسی زمانہ میں متغیر نہیں ہوئی۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (تم خدا تعالےٰ کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھیگے (پ۲۹ ر۱) چنانچہ جو اصولِ قدرت متعین ہیں انمیں کسی قسم کی بے ضابطگی ہرگز نہیں ہوتی اسی وجہ سے کوئی سائنسداں قدرت کے اصول کو صحیح طور پر سمجھکر اُسے اپنا رہنما بناتا ہے تو اسکی بنا پر وہ محیر العقول ایجادات کر کے اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ پھر وہ چیز دنیا کے ہر حصہ میں بغیر کسی تغیر کے اپنی اسی خاصیت پر قائم رہتی ہے۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا بلکہ بدلتا رہتا مثلاً کبھی پانی میں آگ کے خواص آجاتے اور کبھی آگ میں پانی کے کبھی اناج میں زہروں کے اور زہروں میں اناج کے تو اس سے زندگی میں بڑی الجھنیں پیدا ہوجاتیں۔ پانی پیتے وقت یہ ڈر ہوتا کہ شاید اس میں آگ کی طرح جلانیکی خاصیت آگئی ہو۔ یا جس آگ پر پکایا جاتا وہ پانی کی طرح سرد ہوجائے۔ غرض اشیا کے خواص کا ایک حالت پر رکھنا بھی رحمت الٰہی کا ہی اثر ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾

اَلرَّحْمٰن بہت رحم کرنیوالا۔ اَلرَّحِيْم۔ نہایت مہربان۔ ان دونوں کی تشریح بسم اللہ کے سلسلہ میں لکھی جاچکی ہے۔ یہ دونوں نام بھی رحمت ہی سے مشتق ہیں لیکن باہم یہ بھی فرق بیان کیا گیا ہے کہ رحمٰن ایسی نعمتوں کے دینے والے کو کہتے ہیں جسے بندے نہیں لے سکتے جیسے حیات کی نعمت اور حواس ظاہری و باطنی وغیرہ۔ بالفاظ دیگر رحمٰن وہ ہے جو بندے بلاواسطہ نعمت عطا فرماتا ہے اور رحیم سے مراد ایسی نعمت دینے والا

بقیہ حاشیہ صـ۳۱۔ مندرجہ بالا سطور پڑھنے سے یہ وسوسہ پیدا ہو سکتا ہے کہ "یہ ایسے جوابات ہیں جو بچگانی یا سطحی کہے جاسکتے ہیں ایسے بڑے امام ہوتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ بجائے اس کے دوسرے مدلل جوابات دیتے۔ لہذا یہ جوابات تو عالمانہ نہیں کہلا سکتے۔" مگر ایسے حضرات کو یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس قسم کے مواقع میں بحث و مباحثہ مقصد اصلی نہیں ہوا کرتا بلکہ اثباتِ حق مقصود ہوتا ہے جس کے لئے ایسے سریع الفہم اور ساکت کردینے والے دلائل ہی کا مختصر الفاظ میں پیش کردینا عالمانہ اور حکیمانہ ہوا کرتا ہے جسے مختلف استعداد رکھنے والے حاضرین مجلس بھی سمجھ لیں اور طوالت میں گئے بغیر اپنے مقابل کو لاجواب کیا جاسکے جسکا اثر حاضرین پر بھی ہوجائے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے فرمایا تھا جبکہ اس نے آپکے خدا کے بارے میں سوال کیا تھا) کہ "میرا خدا تو مشرق سے آفتاب نکالتا ہے اگر تو خدا ہے تو آفتاب کو مغرب سے نکال" جسے سننے کے بعد نمرود کا جو حال ہوا اُسے قرآن مجید بیان کرتا ہے فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ (یعنی اسپر متحیر رہ گیا وہ کافر (اور اسے کچھ جواب بن نہ آیا) (پ۳ ر۳) اس سے معلوم ہوا کہ بدیہی اور واضح دلائل کا پیش کرنا ہی بڑا کمال ہے اور مجمع عام میں فرقِ صفات میں الجھے بغیر اسطرح قائل کرنا عالمانہ اور پیغمبرانہ طریقہ ہے نہ کہ بچگانہ ۱۲ (از مولف)۔

ہے جیسے عام طور پر لوگ یہ گمان کرتے ہوں اور بظاہر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نعمت بندوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جیسے علاج کرنے سے شفا ملنا وغیرہ حالانکہ شفا دینا درحقیقت اللہ تعالےٰ ہی کا کام ہے اور اسی کی نعمت ہے جو بظاہر معالج کے توسط سے ملتی ہے۔ گویا بالواسطہ نعمت دینے والے کو رحیم کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے یہاں اپنے ان دونوں ناموں کو بیان فرماکر بندوں کو یہ بتایا ہے کہ میں رحمٰن ہوں اسلئے ایسی نعمت کا دینے والا بھی میں ہی ہوں جو کسی توسط کے بغیر تمکو ملے اور رحیم بھی ہوں اسلئے وہ نعمت جو بظاہر کسی بندے کے توسط سے تمکو حاصل ہوتی ہے اسکا دینے والا بھی میں ہی ہوں۔ بس ہر مسلمان کو یہ چاہیئے کہ ہر نعمت کو اللہ تعالےٰ ہی کی طرف سے سمجھے اور اسی کو منعم حقیقی جانے۔

سوال ۵۰۔ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کے بعد اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے بیان کرنے میں کیا مناسبت ہے۔

جواب۔ چونکہ بغیر رحمت کے تربیت ممکن نہیں اسلئے اللہ تعالےٰ نے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کے ساتھ ہی اپنی صفات رحمت یعنی اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو بیان فرمادیا۔ چنانچہ ہر موجود چیز کو حیات اور اس کی بقا کیلئے جس جس وقت جیسی جیسی مقدار میں جن جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے ٹھیک اسی ترتیب کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی ربوبیت اپنی رحمت کاملہ سے وہ تمام چیزیں اسے عطا فرماتی ہے اور اسی نظم وضبط کے ساتھ یہ کائنات چل رہی ہے۔

علاوہ ازیں زندگی کیلئے جن چیزوں کی جس تناسب کے ساتھ ضرورت ہوا کرتی ہے ایسے رب العلمین نے اپنی رحمت عامہ سے اسی مناسبت کے ساتھ فراہم اور سب کیلئے عام کردیا ہے چنانچہ ہوا جو زندگی کیلئے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ پانی اور غذا کے بغیر تو کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

قیامِ جسمِ خاکی ہے نفس پر
ہوا پر ہے بنا اپنے مکاں کی

لہٰذا ہوا کو اسقدر زیادہ اور اتنا عام فرمادیا گیا کہ کوئی وقت اور کوئی جگہ ہوا سے خالی نہیں ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں سانس لینے کی ضرورت ہو تو زندگی کا یہ سب سے اہم جزو خود بخود مہیا رہتا ہے۔ ہوا کے بعد زندگی کیلئے ضروری چیز پانی ہے۔ اسلئے اسے ہوا کی طرح ہر جگہ بسہولت خود بخود مہیا ہوجانے والا نہیں رکھا مگر پھر بھی پانی کو بہت زیادہ مقدار میں پیدا فرمادیا ہے چنانچہ فضائے آسمانی سے ابر کے ذریعہ پانی برستا ہے زمین کے نیچے میٹھے پانی کے خزانے ہیں تو زمین کے اوپر ہر طرف دریا ہیں ندیاں تالاب پیدا فرمایا ہے تاکہ مخلوق کو پانی جو زندگی کا اہم اور ضروری جزو ہے کافی مقدار میں مل سکے۔ پانی کے بعد زندگی کیلئے ان مادوں کی ضرورت ہوتی ہے جن میں غذائیت ہو اسلئے بہ عمومیت اور مقدار میں ان

دونوں سے کم ہیں مگر اور دوسری چیزوں کی بہ نسبت زیادہ ہی ہیں چنانچہ کوئی ایسی مخلوق ہی نہیں جسکے گردو پیش اسکی غذاؤں کا ذخیرہ قدرت نے ہیا نہ کیا ہو۔ اور بعض ایسی اشیاء جو اگرچہ عام طور پر لوازم زندگی میں شامل نہیں ہیں مگر انکی ضرورت بعضوں کو خاص خاص حالات و مقامات کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے وہ انکے لئے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ نے اپنی رحمت سے فراہم فرمادی ہے جیسے سرد ممالک میں گرمی پیدا کرنے والے سامان زندگی وغیرہ۔ اور انسان کو جدوجہد کی ترغیب کیلئے اور مرغوبِ انسانی اشیاء کو عام نہیں کیا ہے جو لوازمِ زندگی نہیں ہیں مثلاً سامانِ تعیشات یعنی عالیشان مکان آرام دہ سواریاں لذیذ ترین غذائیں عمدہ لباس وغیرہ کہ انکے حصول کیلئے انسانی کوشش کو مشروط رکھا مشہور مثل ہے مَنْ جَدَّ وَجَدَ اسلئے جو کامیاب کوشش کرتے ہیں وہ ان نعمتوں سے بھی مستفید ہو جاتے ہیں لیکن لوازم زندگی کی حد تک رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ نے سب کو یکساں بلا امتیاز مستفید ہونے کا موقع دیا ہے۔

سوال ۵۹۔ خدائی احسان اور غیر خدا کے احسان میں کیا فرق ہے؟

جواب۔ مندرجہ ذیل فرق ہے۔

خدائی احسان	غیر خدا کا احسان
۱۔ اللہ تعالےٰ بندے ہی کے فائدے کے لئے بے غرض تربیت فرماتا ہے۔	۱۔ مخلوق محض اپنے فائدے کیلئے کسی کی تربیت کیا کرتی ہے۔
۲۔ تربیت کے سلسلہ میں ہر قسم کے نقصان سے اللہ تعالےٰ منزہ ہے۔	۲۔ جس مناسبت سے تربیت کی جاتی ہے اسی کے موافق تربیت کرنے والے کو کچھ نہ کچھ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔
۳۔ اللہ تعالےٰ سوال سے پہلے عطا فرماتا ہے چنانچہ رحمِ مادر میں جب بچہ بننے لگتا ہے تو اللہ تعالےٰ اسکی پرورش اور حفاظت فرماتا ہے حالانکہ اسوقت کسی انسان کو اپنی بھلائی برائی کے سمجھنے کا قطعاً احساس نہیں رہتا۔	۳۔ جب تک طلب نہ کیا جائے کوئی محسن کچھ بھی عطا نہیں کرتا۔
۴۔ اللہ تعالےٰ مانگنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔	۴۔ محسن اور سخی مانگنے والے کسی نہ کسی نوبت پر تنگ آجاتے ہیں۔
۵۔ اللہ تعالےٰ کا احسان کبھی بھی موقوف نہیں ہوتا۔	۵۔ محسن کا احسان اسکے محتاج ہوجانے یا اسکے مرجانے سے موقوف ہوجاتا ہے۔

۶۔ اللہ تعالےٰ کے احسانات ہر ایک کے لئے عام ہوتے ہیں۔ ۶۔ مخلوق کے احسانات عام نہیں ہوتے بلکہ کسی خاص قوم یا شخص کیلئے مخصوص ہوا کرتے ہیں۔

سوال ۶۰۔ جب تسمیہ میں اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم آچکا تھا تو پھر اس سورۂ فاتحہ میں بھی اسے مکرر کیوں لایا گیا؟ **جواب۔** قبل اسکے کہ اسکی حکمت لکھی جائے یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ الٰہی کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ اسکے الفاظ بار بار پڑھے اور سنے جائیں تو بھی ہر دقت نیا ہی لطف آتا ہے اور قرآنِ مجید کے کتنے ہی دور کیے جائیں مگر سیری نہیں ہوتی ؎

مصلحت نیست مرا سیری ازیں آبِ حیات ضاعفَ اللّٰہُ بِہٖ کُلَّ زَمانٍ عَطَشِیْ

بخلاف دیگر کتابوں کے خواہ وہ کتنی ہی دلچسپ ہوں مگر ایک دو مرتبہ سے زیادہ پڑھ چکنے کے بعد نہ اس میں وہ کشش رہتی ہے نہ دلچسپی پائی جاتی ہے۔

حکمت یہ ہے کہ سوال نمبر ۱۶ میں جس طرح لکھا جا چکا ہے کہ تسمیہ میں اسمِ اللہ سے دل پر جو خوف طاری ہوتا ہے اُسے تسکین دینے کے لئے رحمت والے اسمائے الٰہی اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم لائے گئے۔ اسی طرح اِس سورۂ فاتحہ میں بھی اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم اسلئے بیان ہوا کہ اس کے بعد والی صفت خداوندی مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (بدلہ کے دن (قیامت) کا مالک) کے خوف سے بندے بے تاب نہ ہو جائیں۔ علاوہ ازیں اسکے بعد اِیَّاكَ نَعْبُدُ (ہم تیری عبادت کرتے ہیں) میں عبادت کا ذکر ہے جو طبیعت پر شاق گذرتی ہے۔ اسلئے ان خوف پیدا کرنے والے اسمائے الٰہی سے پہلے رحمت والے اسماء اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم بیان کر دئے گئے۔ تاکہ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے خوف پیدا ہو کر بندہ عبادت پر آمادہ ہو جائے اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم سے اللہ تعالےٰ کے رحم و کرم کا امیدوار بنجائے۔ علاوہ ازیں ان اسماء کی تکرار سے تسمیہ کو سورۂ فاتحہ کیساتھ مربوط بتلایا گیا ہے وہ اسطرح کہ جو صفتِ رحمت تسمیہ میں بیان ہوئی وہی اس سورہ میں بھی موجود ہے یا یہ کہ رحمت کے ذکر کی تکرار اللہ تعالےٰ کے انعام کو زیادہ محبوب رکھنے پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ مشہور ہے مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ یعنی ہر شخص اسکا ذکر زیادہ کرتا ہے جسے بہت چاہتا ہے۔ علاوہ ازیں رحمت کے ذکر کی تکرار اللہ تعالےٰ سے امید کو مضبوط کرتی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں مکرر لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسلئے کہ پہلے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ تسمیہ سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اسلئے یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ بلاغت کلام اپنے اندر کئی مفہوم کو لئے ہوئے رہتی ہے جسے حتی الامکان معلوم کرنا مناسب ہوتا ہے۔

یہ مسلم ہے کہ تمام نعمتوں کا دینے والا اور اپنی مخلوق پر رحم کرنے والا اللہ تعالےٰ ہی ہے اسلئے اسی کو آخرت کے روز جزا و سزا کا استحقاق ہے لہٰذا اسکے بعد فرمایا۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

مٰلِكِ۔ مالک و حاکم۔ یَوْم۔ دن روز۔ دِین۔ حساب۔ بدلہ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ کے معنی ہوئے "بدلہ کے دن یعنی روز قیامت کا مالک یا حاکم"۔ کسی چیز کا مالک وہ کہلاتا ہے جس کو اُس چیز میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو اور چونکہ قیامت میں ہر چیز کے تصرف کا اختیار اللہ تعالےٰ ہی کو ہے اس لئے یہاں اللہ تعالےٰ کو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (بدلہ کے دن کا مالک) کہا گیا ہے۔ لیکن مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ کے قاریوں نے اسے مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (یعنی بدلہ کے دن کا بادشاہ و حاکم) پڑھا ہے اور یہ قرائت بھی اسلئے صحیح ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالےٰ کی بادشاہت کے سوائے کسی دوسرے کی مجازی بادشاہت و حکومت بالکل نہ ہوگی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں قیامت کے احوال کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○ (جس دن سب لوگ (خدا تعالےٰ کے) سامنے آموجود ہوں گے (کہ) انکی بات خدا تعالےٰ سے مخفی نہ رہے گی آج کے دن کس کی حکومت ہے؟ بس اللہ تعالےٰ ہی کی جو یکتا (اور) غالب ہے۔ آج ہر شخص کو اسکے کئے کا بدلہ دیا جائیگا۔ آج (کسی پر) کچھ ظلم نہ ہوگا۔ اللہ تعالےٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے (پ ۲۴ ر ۷) علاوہ ازیں مَلِكِ کا لفظ قرآن مجید میں صفتِ الٰہی کے طور پر دوسری جگہ بھی بیان ہوا ہے جیسے مَلِكِ النَّاسِ ○ (آدمیوں کا بادشاہ) (پ ۳۰ ر ۳۹) الغرض مٰلِكِ اور مَلِكِ دونوں قرائتیں صحیح اور متواتر ہیں۔

سوال ۱۶۔ جب مٰلِكِ (مالک) اور مَلِكِ (بادشاہ) دونوں قرائتیں صحیح اور متواتر ہیں تو پھر بتلایئے کہ ان دونوں میں کس کو یہاں ترجیح دیجا سکتی ہے اور اسکے دلائل کیا ہیں؟

جواب۔ مٰلِكِ (مالک) ہی کی قرائت کو ترجیح حاصل ہے جسکے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(۱) مٰلِكِ (مالک) کہنے میں مَلِكِ (بادشاہ) کا مفہوم موجود ہے مگر مَلِكِ (بادشاہ) کہنے میں مٰلِكِ (مالک) کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ وہ اسطرح کہ کسی چیز کا مالک ہونا اس چیز پر پوری طرح مختاری کو ظاہر کرتا ہے جس کے اندر حاکمیت بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن مَلِكِ (بادشاہ) مختار کل نہیں ہوتا بلکہ وہ غیر

ہوتا ہے اور اپنی محکوم چیز پر ایک خاص حد تک ہی اختیار رکھتا ہے جیسے صرف احکام نافذ کرنے کا اختیار وغیرہ۔ غرض مَلِكِ (بادشاہ) اپنے محکوم کا مالک نہیں ہوتا مگر مٰلِكِ (مالک) اسے کہا جاتا ہے جو اپنی مملوک (چیز) کا نہ صرف مالک ہی ہوتا ہے بلکہ حاکم بھی ہوتا ہے۔ لہذا معنوی لحاظ سے یہاں مٰلِكِ (مالک) پڑھنا ہی مناسب ہے۔

(۲) علاوہ ازیں قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ کو "مالک" کہنے کی تعلیم بھی دی گئی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالےٰ ہے قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ (اے محمد) آپ (اللہ تعالےٰ سے) یوں کہئے کہ اے اللہ! بیشک تو تمام ملک کا مالک ہے جسکو چاہے ملک دیدیتا ہے اور جس سے چاہے ملک چھین لیتا ہے اور جسے تو چاہے غالب کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے پست کر دیتا ہے تیرے ہی اختیار میں ہے سب بھلائی۔ بلاشبہ تو ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے (پ۳ ر۱۱) اور

(۳) مٰلِكِ (مالک) پڑھنا اسلئے بھی مناسب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تلاوت کرنے والے کو قرآن مجید کے ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں"۔ لہذا جو شخص مَلِكِ (بادشاہ) پڑھے اس سے دس نیکیاں زیادہ اس شخص کو ملتی ہیں جو مٰلِكِ (مالک) پڑھے کیونکہ مَلِكِ سے مٰلِكِ میں ایک حرف الف زائد ہے۔

(۴) یہاں آیۃ یَوْمِ الدِّیْنِ کے مدنظر مَلِكِ (بادشاہ) سے زیادہ مناسب مٰلِكِ (مالک) کہنا اسلئے بھی ہے کہ اُس دن جب کہ طاعت کا ثواب اور نافرمانی کا عذاب ظاہر ہوگا یعنی قیامت کے دن اللہ تعالےٰ بادشاہ کی طرح کسی خاص حد تک ہی اختیار روا لانہ ہوگا بلکہ وہ مالک و مختار کل ہوگا اور ظاہری و باطنی پورا تصرف اُسی کو حاصل رہیگا۔ کسی کو اسکے احکام سے سرتابی کی مجال قطعاً نہ ہوگی اور یہ بھی ناممکن ہوگا کہ سفارش کر کے کسی کو اُس مالک الملوک سے زبردستی نجات دلائی جاسکے یا عذاب دینے سے اسکو روک سکے قرآن مجید میں ہے یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ (عذاب کرتا ہے جسکو چاہتا ہے اور بخشتا ہے جسکو چاہتا ہے اور اللہ تعالےٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (پ۶ ر۱۰)

لہذا ہر مسلمان کو چاہئے کہ نیک عمل کر کے امید رحمت اور عذاب الٰہی سے خوف کرتے ہوئے اپنے گناہوں سے سچی توبہ[1] کرلے لیکن جو لوگ اپنے گناہوں سے سچی توبہ نہ کر کے صرف یہ سمجھ کر

[1] چنانچہ قرآن مجید میں ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا (یعنی اے ایمان والو تم اللہ کے آگے سچی توبہ کرو (پ۲۸ ر۲۰).

خدا تعالےٰ کی نافرمانی پر اڑے رہتے ہیں کہ "ہم کو دوزخ کے عذاب کا کیا ڈر ہے قیامت میں ہم کو ہمارے پیر[1] بخشوالیں گے وغیرہ" وہ خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (یعنی ایسا کون شخص ہے جو اس (اللہ تعالےٰ) کے پاس (کسی کی) سفارش کر سکے بغیر اسکی اجازت کے (پ۳ ر۲) پس اس طرح کہنے والوں کو یہ سمجھ رکھنا چاہیے کہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ کی اجازت کے بغیر کسی پیر یا ولی یا پیغمبر کی یہ مجال ہرگز نہ ہوگی کہ وہ کسی معمولی گنہگار کو بھی اللہ تعالےٰ کی مرضی کے خلاف بخشوا کر جنت میں پہنچا سکیں۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ فِتْنَتَہٗ فَلَنْ تَمْلِکَ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا (یعنی اور جسکا خراب[2] ہونا خدا تعالےٰ ہی کو منظور ہو تو اسکے لئے اللہ تعالےٰ سے آپکا کچھ زور نہیں چل سکتا (پ۶ ر۱۰) علاوہ ازیں کسی کو یہ کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ اسکے حق میں حق تعالےٰ کسی کو شفاعت کرنے کی ضرور اجازت دیگا۔

جاننا چاہئے کہ رحمتِ الٰہی سے امید رکھنے کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ کوئی شخص اپنی پوری زندگی کو صرف یہ کہتے ہوئے اللہ تعالےٰ کی نافرمانی میں بسر کر دے کہ "میں اللہ تعالےٰ سے امید رکھتا ہوں"

---

[1] اللہ تعالےٰ کی نافرمانی پر اڑے رہنا سخت غلطی ہے۔ البتہ وہ گناہ جو نادانی کیوجہ سرزد ہو جائے فوری توبہ کر لینے سے معاف ہو سکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ○ وَلَیْسَتِ التَّوْبَۃُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَہُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ اَعْتَدْنَا لَہُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ○ (یعنی سوائے اسکے نہیں ہے کہ توبہ قبول کرنا اللہ تعالےٰ ہی کے ذمہ ہے واسطے ان لوگوں کے جو نادانی سے گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر جلدی سے توبہ کر لیتے ہیں پس ایسوں پر تو خدا تعالےٰ توجہ فرماتا ہے اور اللہ تعالےٰ خوب جاننے والا حکمت والا ہے! اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں یہانتک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں اور نہ اُن لوگوں کی جنکو حالتِ کفر میں موت آجاتی ہے! ان لوگوں کیلئے ہم نے ایک دردناک سزا تیار کر رکھی ہے (پ۴ ر۱۴) دوسری جگہ ارشاد ہے وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اہْتَدٰی (اور میں ایسے لوگوں کیلئے بڑا بخشنے والا بھی ہوں جو توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں پھر (اسی) راہ پر قائم (بھی) رہیں (پ۱۶ ر۱۳)۔

[2] ایسا خیال اسلئے بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے فرمایا ہے کہ "اے فاطمہ! یہ بھروسہ نہ کرنا کہ تو محمدؐ کی بیٹی ہے۔ عمل کر عمل کر عمل کر۔"

[3] بعض لوگ اس سے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انسان مجبوراً گناہ کرتا ہے۔ جو غلط ہے۔ اسپر مکمل بحث کتاب "اثبات تقدیر" میں لکھی گئی ہے جسکے مطالعہ سے انشاء اللہ تعالےٰ ناظرین کرام کو ضرور تشفی ہو جائیگی۔ (از مؤلف)

کیونکہ امید اسی کو کہتے ہیں جسکے اندر کچھ خوف بھی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابن عطیہؒ نے کہا ہے کہ "امید کے ساتھ ایک طرح کا خوف ہوتا ہے جیسے خوف میں ہمیشہ ایک طرح کی امید لگی ہوتی ہے" اگر ایسا کہنے والا حقیقی معنی میں امید کرنے والا ہوتا تو پھر اس طرح بے خوف ہو کر اللہ تعالیٰ کا نافرمان نہ ہوتا۔ ہاں امید کرنے والے ایسے لوگ ہوا کرتے ہیں جن میں اس خوف کا اثر بھی پایا جاتا ہے جو امید کے مفہوم میں موجود ہے۔ جس کی بنا ر پر وہ ڈرتے ہوئے خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے کام کرتے ہیں اور اُسکے ثواب کی توقع رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لا اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (یعنی تحقیق جو لوگ ایمان لائے اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترکِ وطن کیا اور جہاد کیا ایسے لوگ رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (پ ۲ ر ۱۱) اس آیۃ میں یہ امر قابل غور ہے کہ ان اوصاف حمیدہ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں بھی يَرْجُوْنَ (امیدوار ہوا کرتے ہیں) فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ سیہ کاری میں زندگی بسر کرنے والا تو کجا وہ شخص بھی اپنے کو یقینی جنتی نہیں کہہ سکتا جو رضائے الٰہی اور طاعت و فرمانبرداری میں اپنی زندگی صرف کرے۔ کیونکہ اعتبار اپنے خاتمہ کا ہے۔ ہاں یقیناً جنتی وہ کہے جا سکتے ہیں جنھیں انکی زندگی ہی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنتی کہدیا گیا ہے جیسے عشرہ[1] مبشرہ صحابہؓ جن کے منظوم اسمائے مبارکہ یہ ہیں ؎

دہ یار بہشتی اند قطعی — بوبکرؓ و عمرؓ علیؓ و عثمانؓ
سعدؓ است و سعیدؓ و بوعبیدہؓ — طلحہؓ است زبیرؓ و عبدرحمانؓ

اور غزوہ بدر و اُحد اور بیعۃ الرضوان میں شریک صحابہ بلکہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بھی جنتی ہونا احادیث سے ثابت ہے۔

بعض تو خوش فہمی میں یہانتک کہدیا کرتے ہیں کہ "جنت تو ہمارے باوا آدمؑ کا گھر اور ہماری ماں حواؑ کا وطن ہے۔ تو پھر ہم اس میں کیوں نہ جا سکیں گے وغیرہ" مگر ایسوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت آدمؑ و حواؑ علیہما السلام صرف ایک نافرمانی کیوجہ جنت میں رہنے کے باوجود جب جنت سے نکالدئے جا سکتے ہیں تو انکی اولاد اللہ تعالیٰ کی بیشمار نافرمانیاں کرنے پر بھی کس طرح جنت میں داخل ہونے کی مستحق ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے خیالات سے سب مسلمانوں کو محفوظ رکھے رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَ

---

[1] (۱) حضرت ابوبکر صدیقؓ (۲) حضرت عمر فاروقؓ (۳) حضرت عثمان غنیؓ (۴) حضرت علیؓ (۵) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (۶) حضرت سعید بن زیدؓ (۷) حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ (۸) حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ (۹) حضرت زبیر بن العوامؓ (۱۰) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ - ۱۲

اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝ (اے رب میں تیری پناہ لیتا ہوں شیطان کے وسوسوں سے اور اے رب میں تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ شیطان میرے پاس بھی آئیں (پ ۱۸ ر ۶)۔

سوال ۶۲۔ جب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (مالک ہے بدلہ کے دن کا) فرما کر صرف روز قیامت کا مالک بتایا گیا ہے تو پھر اسی سورہ سے یہ کس طرح ثابت ہو سکتا ہے اللہ تعالےٰ روز قیامت کے سوائے دن کا بھی مالک یا بادشاہ ہے؟

جواب۔ اللہ تعالےٰ نے اس آیتہ سے پہلے رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سب عالموں کا پروردگا) فرما کر یہ بتلا دیا کہ اللہ تعالےٰ صرف مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (قیامت کے دن کا مالک) ہی نہیں ہے بلکہ سب عالموں جس میں دنیا و آخرت بھی شامل ہے کا پروردگا اور مالک حقیقی بھی ہے کیونکہ اسی نے سب کو پیدا کیا اور پیدا کرنے والا ہی اپنی پیدا کی ہوئی چیز کا حقیقی مالک ہوا کرتا ہے۔

شبہہ:۔ تو پھر اس آیتہ میں تخصیص کے ساتھ روز قیامت کا مالک کہنے کی کیا وجہ ہے؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں تو مجازی مالک و بادشاہ بھی ہوتے ہیں مگر قیامت میں سوائے اللہ تعالےٰ کے نہ کوئی بادشاہ رہے گا نہ کوئی کسی کا مالک۔ یعنی اس دن غیر خدا کی مجازی ملکیت و حکومت بالکل نہ ہوگی اور تمام مخلوق بے قرار ہو کر خود جان لیگی کہ آج اللہ تعالےٰ کے سوائے کسی دوسرے کو نہ ملکیت حاصل ہے نہ اختیار و حکومت جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝ (اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہ روز جزا کیسا ہے (اور ہم) پھر (مکرر کہتے ہیں کہ) آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہ روز جزا کیسا ہے وہ ایسا دن ہے جس میں کسی شخص کا کسی شخص کے نفع کے لئے کچھ بس نہ چلے گا اور تمام تر حکومت اُس روز اللہ تعالےٰ ہی کی ہوگی (پ ۳۰ ر ۷)۔

سوال ۶۳۔ تو پھر دنیا میں غیر خدا کو مالک یا بادشاہ جو کہا جاتا ہے وہ کہاں تک درست ہے؟

جواب۔ دنیا میں جو بھی مالک یا بادشاہ کہلاتے ہیں وہ حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہوتے ہیں اور غیر خدا کو مجازاً ایسا کہنا اسلئے غلط نہیں کہ قرآن مجید میں اسکی کئی مثالیں موجود ہیں کہ غیر خدا کو مَلِكٌ (یعنی بادشاہ) بھی کہا گیا ہے اور مٰلِكٌ (مالک) بھی کہا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (یعنی تحقیق کہ اللہ تعالےٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا (پ ۲ ر ۱۶)۔ اور اسی طرح بندوں کے مالک ہونے کا ذکر بھی قرآن مجید میں آیا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ (یعنی اے پروردگار میں اپنی جان اور اپنے

بھائی پر البتہ اختیار رکھتا ہوں (پ ۶ ر ۸) دوسری جگہ ارشاد ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (یعنی اے ایمان والو چاہئے کہ اجازت مانگا کریں تم سے (تمہارے پاس آنے کیلئے) وہ لوگ جن کے مالک ہوئے ہیں تمہارے داہنے ہاتھ (یعنی غلام) (پ ۱۸ ر ۱۴)۔

سوال ۶۴۔ جب حقیقی بادشاہت اور مالکیت حق تعالےٰ ہی کے لئے ہے تو پھر دنیا میں یہ مجازی طور پر اشیا میں تصرف و مالکیت اور بادشاہت انسان کو عطا کرنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب۔ پیدائشی طور پر ہر آدمی اللہ تعالےٰ کے احکام کو قبول کرنے کی استعداد رکھتا ہے اور سب کام اپنے ارادہ سے کرتا ہے جس میں اللہ تعالےٰ کی قدرت و حکمت مخفی طور پر کارفرما ہوتی ہے۔ پس اگر ہر انسان کو دنیا میں تصرف و ملکیت کا موقع نہ دے کر اللہ تعالےٰ مجبور بنا دیتا اور بعض کو بعض پر حاکم نہ بناتا تو پھر اس سے اچھے اور برے عمل کے صادر کرنے کا موقع باقی نہ رہتا خصوصاً ان اعمال کا جنکا تعلق مال۔ حیوانات کے ذبح اور نفقہ کی ادائی اور خیرات و مبرات وغیرہ سے ہے اسی طرح وہ اچھے اور برے عمل جن کا تعلق رعایا کی نگہبانی اور دیگر ممالک سے میل جول کے ساتھ ہے حکمرانی کے بغیر ناممکن تھا۔ اسلئے دنیا میں انسان کو اللہ تعالےٰ نے بادشاہت بھی دی اور موجودات پر اقتدار بھی بہت کچھ عطا فرمایا اور اشیا کا مالک بھی بنایا۔ کہ قیامت میں کوئی انسان اپنی بے بسی کو گنہگار ہونے کا سبب قرار دیکر اقتدار و مالکیت کے نہونے کا عذر نہ پیش کر سکے۔

سوال ۶۵۔ دنیا کی طرح میدانِ قیامت میں بھی انسان میں مجازی مالکیت اور بادشاہت کس لئے باقی نہ رہیگی؟ **جواب۔** اگر قیامت میں بھی انسان کی مالکیت و بادشاہت دنیا کی طرح قائم رکھی جاتی تو نیک و بد کی جزا کا مقصد باقی نہ رہتا۔ جیسا کہ دنیا والوں کا بھی قاعدہ ہے کہ جب کسی کو بحیثیت ملزم حاضر عدالت کیا جاتا ہے تو پہلے اسکے تمام اختیارات خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں صلب کر کے بے اختیار بنا کر اسے منصف کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان روزِ حساب بے اختیاری کے عالم میں مالکِ روزِ حساب کی پیشی میں پیش ہوگا۔ اور ہر چیز انسان کے اقتدار سے خارج ہو جائے گی حتیٰ کہ انسان کو اپنے اعضاء پر بھی اختیار باقی نہ رہیگا جیسا کہ ارشاد باری تعالےٰ ہے اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (یعنی آج ہم

ل یہاں جو شبہات پیدا ہو سکتے ہیں انکے جواب میری کتاب "اثبات تقدیر" میں شائقینِ کرام ملاحظہ فرما کر اپنی پوری تشفی فرما سکتے ہیں۔ جسے یہاں بخوفِ طوالت نہیں لکھا گیا۔ (از مؤلف)۔

انکے موہنوں پر مہر لگا دینگے اور انکے ہاتھ ہم سے باتیں کرینگے اور انکے پاؤں گواہی دینگے جو کچھ یہ لوگ کمایا کرتے تھے۔ (پ۲۳ ر۳) حضرت والد ماجد مدظلہ فرماتے ہیں ؎

وہ اعضا کا تکلم، وہ زباں پر مہر، وہ پرسش
بڑا سخت امتحانِ حشر ہے سب امتحانوں میں

چنانچہ وہ اعضا جنکو دنیا میں جھوٹ سچ بولنے اور ان سے اچھے بُرے کام لینے کا جو اس انسان کو ہر وقت اختیار حاصل تھا وہ بھی قیامت کے دن چھین لیا جائیگا جسکی وجہ انسان کے اعضا تک خود اسکی مرضی کے خلاف سچی گواہی اللہ تعالےٰ کے حکم سے دینگے۔ جسکی وجہ انسان متعجب ہو کر اپنے اعضا سے پوچھنے لگیگا کہ "اے میرے اعضا تم نے میرے خلاف کیوں گواہی دی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے حَتّٰٓی اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا، قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (یہانتک کہ جب وہ اسکے قریب آجائیں گے تو انکے کان اور آنکھیں اور انکی کھالیں ان پر انکے اعمال کی گواہی دینگے۔ اور (اسوقت) وہ لوگ (متعجب ہو کر) اپنے اعضا سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف میں کیوں گواہی دی وہ (اعضا) جواب دیں گے کہ ہم کو اس اللہ نے گویائی دی جس نے ہر (گویا) چیز کو گویائی دی اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر لائے گئے ہو۔

سوال ۶۶۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (بدلہ کے دن کا مالک) کہنے کے بجائے صرف مٰلِكُ الدِّيْنِ (یعنی بدلہ کا مالک) بھی کہدینا کافی تھا تو پھر یَوْم کا لفظ کیوں لایا گیا؟ **جواب۔** دین[1] کے معنی حساب اور بدلہ کے ہیں۔ چنانچہ مذہب کو بھی دِیْن اسی لئے کہتے ہیں کہ اسی کی بناپر ہر ایک کو بدلہ ملتا ہے۔ اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ کسی عمل کا بدلہ ہر وقت نہیں ملا کرتا بلکہ بدلہ دئے جانے کا ایک خاص وقت یا دن ضرور مقرر ہوتا ہے خواہ دنیاوی بدلہ ہو یا آخرت کا۔ لہذا وقت کے ذکر کے بغیر صرف مٰلِكُ الدِّيْنِ (بدلہ کا مالک) کہدینا غلط ہوتا تھا اسلئے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (بدلہ کے دن کا مالک) فرمایا جس میں یَوْم یعنی دن سے مراد مطلق وقت ہے۔ اگر یَوْم (دن) کا ذکر نہ کیا جاتا تو بدلہ کا وقت مقرر ہونے کا مفہوم نہ سمجھا جاتا پس یَوْمِ الدِّيْنِ (بدلہ کا دن) فرما کر روز حساب کے مقرر ہونے کو ظاہر فرما دیا گیا جس سے قیامت کا یقیناً ہونا بھی ثابت ہوتا ہے جس میں اعمال کا

---

[1] اور دین کے معنی قانون کے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (یعنی حضرت یوسف علیہ السلام) اپنے بھائی کو اس بادشاہ (مصر) کے قانون کی رو سے نہیں لے سکتے تھے (پ۱۳ ر۳) از مؤلف ۱۲

حساب حقیقی طور پر ہوگا نہ کہ خیالی و مجازی کیونکہ یہ معاد جسمانی ہوگا روحانی نہیں۔ اور یہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (بدلہ کے دن کا مالک) وہ صفتِ الٰہی ہے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی بھی بنیاد ہے۔ کیونکہ اسکا فطرتی نقش ہر انسان کو برائی اور گناہ کے ارادہ کے وقت خود بخود ڈراتا ہے اور نیک ارادہ اطاعتِ خدا اور رسول کیوقت خوش کرتا ہے۔ اور اگر بدلہ کا موقت ہونا ظاہر نہ کیا جاتا تو کسی ظالم وغیرہ کو فوراً اسکے کئے کا بدلہ نہ ملنے سے خواہ مخواہ گمراہ اور کجرو لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عدالت کے بارے میں شبہ آتا۔ اور اپنے نیک کاموں سے اُسی وقت اچھا نتیجہ مرتب نہ ہونے کی وجہ نیکی کرنے والا مایوس اور برا کام کرنے والا برا نتیجہ نہ پانے سے دلیر بھی ہو جاتا۔ اسلئے یہاں يَوْمِ الدِّيْنِ (بدلہ کا دن) فرما کر دونوں قسم کے لوگوں کو آگاہ فرما دیا اور ساتھ ہی ساتھ جزائے کامل کے وقت کو یعنی قیامت کو مبہم کرکے بندوں کے دلوں کو خوف اور امید[1] سے بھی بھر دیا۔ تا ہر وقت سب کو یہ پیش نظر رہے کہ بدلہ کا ایک دن مقرر ہے جو ضرور آنے والا ہے جس میں اچھے اور برے اعمال کی جانچ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (یعنی پس جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کریگا وہ (وہاں) اسکو دیکھ لیگا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کریگا وہ اسکو دیکھ لے گا (پ ۳۰ ر ۲۴) کے بعد تصفیہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی عدالت سے جزا یا سزا ضرور ملے گی۔

نکتہ | رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (سب عالموں کا پالنے والا) میں اظہار ربوبیت کے بعد الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (بہت مہربان نہایت رحم والا) میں شان رحمت بیان کرکے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (بدلہ کے دن کا مالک) سے صفتِ عدالت کو ظاہر کرکے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ رحمت سے عدالت کا الگ ہونا مناسب نہیں ہے۔

سوال ۶۷۔ اس سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کے جتنے نام آئے ہیں انکے بیان میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ **جواب**۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ

---

[1] اس لئے کہ خوف و امید دونوں کا یکساتھ پایا جانا ایمان کی علامت ہے چنانچہ قرآن مجید میں ایمانداروں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (یعنی وہ (ایماندار) اپنے پروردگار کو (اسکے عذاب سے) ڈر کر اور (اس کی رحمت سے) امید رکھکر پکارتے ہیں (پ ۲۱ ر ۱۵) اور محض ناامیدی کو کافروں کی علامت کہا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (یعنی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں (پ ۱۳ ر ۴) اسی طرح اپنے کو عذاب الٰہی سے بالکل امن میں سمجھنا بھی کفر ہے۔ ۱۲

میں پانچ ناموں (۱) اَللّٰہ (۲) رَبّ (۳) رَحمٰن
(۴) رَحِیم (۵) مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن کے ساتھ
اپنی ذاتِ مقدس کی صفت بیان فرما کر ایک
لطیف اشارہ یہ فرمایا ہے کہ "اے میرے بندے!
میں نے تجھے ایجاد کا لباس پہنایا اور پیدا کر کے
عدم سے وجود میں لایا تو یہ مجھ اَللّٰہ ہی کا کام ہے
اس کے بعد میں نے تیری پرورش کی تو میں تیرا
رَبّ (پالنے والا) ہوں۔ پھر تو نے میری نافرمانی
کی مگر میں نے تجھ پر رحم کیا اور اپنے وہی الطاف
تجھ پر باقی رکھے تو میں رَحمٰن (بڑا مہربان) ہوں
جب تو نے توبہ کی اور میری طرف رجوع ہوا تو
میں رَحِیم (نہایت رحم والا) ہوں۔ پھر چونکہ
تیرے نیک کاموں کا بدلہ دینا ضرور ہے اسلئے
میں مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن (بدلہ کے دن کا مالک)
بھی ہوں۔

کلامِ الٰہی ایک ایسی زنجیر ہے جس کی
کڑیاں ایک دوسرے سے بیحد مربوط اور ملی ہوئی
ہیں۔ چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ گویا ایک دعوٰے ہے کہ
"سب تعریف اللہ تعالےٰ ہی کے واسطے ہے"
جس پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ "ایسا نہیں بلکہ بعض
خوبیاں دوسرے کیلئے بھی ہیں یا یہ کہ سب تعریفیں
اللہ تعالےٰ ہی کیلئے کس واسطے ہیں؟" تو اسکے
جواب میں اسکے بعد رَبِّ الْعٰلَمِیْن (سب عالموں
کا پالنے والا ہے) بیان ہوا ہے یعنی وہ کسی کی
پرورش مجبوراً نہیں کرتا کیونکہ اس کی شان
فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (یعنی وہ جو چاہے سب کچھ کر گزرتا ہے
ہے (پ ۳۰ ر ۱۰) وہ سب عالموں کی پرورش بھی
اپنے اختیار ہی سے کرتا ہے اسلئے وہی تمام تعریفوں
کا مستحق ہے۔ اب جبکہ ان شکوک کو رفع کیا گیا
جو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریف اللہ تعالےٰ ہی
کے واسطے ہے) کہنے سے کسی منکر کے دل میں
پیدا ہو سکتے تھے تو پھر بتایا گیا کہ تمام عالم کی پرورش
اسی کا کام ہو سکتا ہے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا
ہو اس لئے اسکے بعد اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (بڑا
مہربان نہایت رحم والا) فرمایا گیا۔ پھر اس امر
کے بتلانے کی ضرورت تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ کی
رحمت سے کسی کو دنیا کی بیشمار نعمتیں حاصل
بھی ہو جائیں تو آخر کار ناچار ہو کر ہر چیز کو چھوڑنا
ہی پڑتا ہے۔ اسلئے ہر انسان کو یہ سمجھنا چاہیئے
کہ اگر اسے عقبیٰ میں عیش و آرام اور فرحت نصیب
نہ ہو تو گویا وہ اس دنیا کی چندروزہ فرحت کو بیچکر
گھاٹے میں ہے۔ لہذا اسکے بعد مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن
(مالک ہے بدلہ کے دن کا) فرما کر یہ بتلا دیا کہ اللہ
تعالےٰ بدلہ کے دن کا مالک و مختارِ کل ہے۔ اور
اس دن ایمانداروں کے ساتھ اپنی رحمتِ کاملہ
سے بہت زیادہ احسان فرمائے گا۔ پس مٰلِکِ
یَوْمِ الدِّیْن گویا اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کیلئے تتمہ
اور تکملہ کے طور پر ہے۔

علاوہ ازیں جب کسی سے محبت کیجاتی ہے
تو (۱) کسی طمع اور نفع کے بغیر صرف ذات سے

محبت ہوا کرتی ہے یا (۲) پہلے حقوق کے لحاظ سے یا (۳) موجودہ بخششوں اور نعمتوں کی وجہ یا (۴) آئندہ کی بہتری اور ہر قسم کی بھلائی کی امید پر۔ ان سب صورتوں کو ان تین آیتوں میں واضح کیا گیا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ جو بھی وجہ محبت ہو سکتی ہے وہ اللہ تعالےٰ کیلئے ان میں موجود ہے۔ چنانچہ جو محبت کرنے والا کسی طمع اور نفع کے بغیر صرف ذات سے محبت کرنا چاہے اس کیلئے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے) میں ذات باری تعالیٰ کیطرف رہبری موجود ہے کیونکہ حمد تقرب الٰہی کا راستہ بتلاتی ہے اور جو ایسا ہو کہ پہلے حقوق کے لحاظ سے اور موجودہ حقوق کی بنا پر محبت کرتا ہے اس کیلئے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سب عالموں کا پالنے والا) میں حقوق سابقہ و موجودہ کو یاد دلایا گیا ہے اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (بڑا مہربان نہایت رحم والا) میں بھی اپنی ہمہ وقت رحمت و عنایت کا اظہار فرمایا گیا ہے۔ اور مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (بدلہ کے دن کا مالک ہے) سے آئندہ کی لازوال نعمتوں اور نا متناہی بخششوں کا نقشہ جمایا تا ایسے لوگ جو آئندہ کی بہتری اور ہر قسم کی بھلائی کی امید پر کسی سے محبت کیا کرتے ہیں وہ بھی اللہ تعالےٰ ہی سے محبت کریں۔

جب ایمانداروں کے دل میں اللہ تعالےٰ سے بیحد محبت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے ایمانداروں کی صفت بیان فرمائی ہے۔
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (یعنی اور جو لوگ ایمان لائے ہیں انکو (صرف) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے (پ۲ ر۴) تو پھر انکی نگاہوں میں کسی کی ہستی نہیں جچتی اور عبادت کرنے اور اپنی حاجتوں کو طلب کرنے میں بلکہ ہر کام میں وہ اللہ تعالےٰ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور اسی کی عبادت کرتے ہیں ورنہ اسکے سوائے محبت کا اور کیا طور ہو سکتا ہے۔ اسلئے ان تینوں آیتوں کے بعد اللہ تعالےٰ نے بندوں کے منہ سے کہلوایا۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝۴

اِیَّاکَ۔ تیری۔ تجھ سے کرتے۔ نَعْبُدُ۔ ہم عبادت کرتے ہیں۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ یعنی تیری ہی ہم عبادت ہیں۔ وَ۔ اور۔ نَسْتَعِیْنُ۔ ہم مدد چاہتے ہیں۔ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے معنی ہوئے۔ تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں۔

سورہ کی ابتدا سے یہانتک حمد و ثنا کا ذکر تھا۔ جسے تین اوصاف پر قائم فرمایا گیا ہے یعنی (۱) حمد اسی ذات کیلئے ہے جو رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سب عالموں کا پالنے والا) ہو اور (۲) اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (بڑا مہربان نہایت رحم والا) ہو اور

(۳) مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (بدلے کے دن کا مالک) بھی۔ اور جس میں یہ متذکرۂ بالا تین صفات نہوں وہ حقیقی حمد کا مستحق نہیں اور جو حقیقی حمد کا مستحق نہیں وہ عبادت (بندگی) اور استعانت (مدد طلب کئے جانے) کا بھی ہرگز سزاوار نہیں ہوسکتا۔ اور جن لوگوں نے پیغمبر کے معجزات کو دیکھنے کے بعد اللہ تعالےٰ پر ایمان لانے کے بجائے خود اُن ہی پیغمبر کو خدا کہدیا ہے۔ جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہتے ہیں اُنکا رد بھی ان ابتدائی تین آیات میں یوں فرمایا گیا کہ یہ سب عالم جن میں تمام جھوٹے معبود بھی شامل ہیں خواہ وہ پیغمبر ہوں یا بُت وغیرہ اللہ تعالےٰ ہی کے محتاج ہیں۔ جس سے حق ہیں بندے کی نگاہ میں اللہ تعالےٰ کے سوائے کوئی بھی عبادت و استعانت کے لائق باقی نہیں رہا۔ ہندا اس کے بعد اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کہکر گویا بندے نے تمام جھوٹے معبودوں کی نفی کردی۔

سوال ۶۸۔ ابتدائی تین آیات میں تو غائبانہ حالت اسکے بعد حاضر کے صیغے بیان کرنے میں کیا حکمتیں ہیں؟ **جواب۔** (۱) ابتدائی تین آیات میں غائبانہ نوعیت یہ بتلاتی ہے کہ بندے نے بغیر دیکھے اللہ تعالےٰ کو اسکی صفات مخصوصہ کے ساتھ یاد کیا ہے (۲) اگرچہ اللہ تعالےٰ ہر جگہ موجود ہے غائب نہیں ہے مگر پھر بھی غائبانہ طریقہ سے اللہ تعالےٰ کی حمد وثنا اسلئے کی گئی کہ ممدوح کی وہی تعریف اعلیٰ درجہ کی کہلاتی ہے جو غائبانہ ہو (۳) اسکے بعد اُس کلام کا ذکر ضروری تھا جو اس حمد وثنا کا نتیجہ ہو اور وہ دعا ہے جس کیلئے حاضری مناسب ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے بعد طرز کلام بدلکر حاضر کے صیغے بیان ہوئے۔ یا یہ کہ (۴) بندہ نے جب ابتدائی تین آیتیں پڑھ لیں تو گویا اس نے اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات کا اقرار کرلیا جس سے اسکے دل پر عظمتِ الٰہی کا ایسا نقشہ جم گیا کہ اب بندہ اپنے اللہ تعالےٰ کو اپنے روبرو سمجھ کر گویا بحالتِ حضوری عرض کرنے لگا اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ یعنی تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں (۵) ابتدائی تین آیات تک بندے کی نظر گویا اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کی طرف اور اپنی طرف اور اِن دیگر عالموں کی طرف تھی جن پر اللہ تعالےٰ کی نعمتیں نازل ہوتی ہیں جسکی وجہ بندے کو اللہ تعالےٰ کی صفات کا گویا بخوبی مشاہدہ ہوگیا تو اب غیاب سے حضوری کی طرف رجوع ہوکر ان نعمتوں کے عطا فرمانے والے کی طرف متوجہ ہونا بندہ کیلئے ضروری ہوا اسلئے اس کے بعد اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ یعنی تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں کہکر مخاطب کرتے ہوئے کلام کو شروع کیا۔

سوال ۶۹۔ اللہ تعالےٰ نے یہاں اِیَّاكَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) میں اپنی ذاتِ مقدس کو نَعْبُدُ سے پہلے اِیَّاكَ (تیری ہی) لاکر کیوں مقدم فرمایا جبکہ سورہ کی ابتدا میں اَلْحَمْدُ کے بعد اپنا اسم مبارک اللہ لایا ہے اور لِلّٰہِ الْحَمْدُ نہیں فرمایا تو فرمایئے کہ ان دونوں مقامات میں ایک دوسرے کے برعکس ذات الٰہی کے بیان کی تقدیم و تاخیر سے کس طرف اشارہ کیا گیا ہے؟ جواب۔ چونکہ اللہ تعالےٰ کے سوائے دوسرے کی بھی حمد (تعریف) کرنا جائز ہے جیسا کہ سوال نمبر ۵۲ میں بتلایا گیا ہے اسلئے اللہ تعالےٰ کا نامِ مبارک اَلْحَمْدُ کے بعد لایا گیا بخلاف اسکے عبادت چونکہ صرف اللہ تعالےٰ ہی کی کرنی چاہیئے اور اسکے سوائے کسی کی عبادت ہرگز درست نہیں اسلئے یہاں نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) سے پہلے اِیَّاكَ (تیری ہی) کو تخصیص کے لئے بیان فرمایا۔ تا یہ اس امر پر دلالت کرے کہ عبادت صرف اللہ تعالےٰ ہی کی کرنی چاہیئے۔ پس اس لحاظ سے اِیَّاكَ نَعْبُدُ کے معنی یہ ہوئے کہ "اے خدا! ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں کسی اور کی عبادت نہیں کرتے۔"

الحاصل اِیَّاكَ (تیری ہی) پہلے آنے سے صرف اللہ تعالےٰ ہی کیلئے عبادت کی خصوصیت کا اظہار ہوا ہے۔ اسی طرح نَسْتَعِیْنُ (ہم مدد چاہتے ہیں) سے بھی پہلے اِیَّاكَ (تیری ہی) دوبارہ لاکر یہ بتلایا گیا کہ صرف عبادت ہی نہیں بلکہ مدد بھی اللہ تعالےٰ ہی سے طلب کرنی چاہیئے۔

سوال ۷۰۔ نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) سے پہلے اِیَّاكَ (تیری ہی) لانے میں اور کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں؟ جواب۔ (۱) عبادت بندے کی طرف سے بارگاہِ رب العزت میں گویا ایک ہدیہ یا نذرانہ ہے اور نذرانہ سے پہلے چونکہ اس وجود و عظمت کا تصور پیدا ہونا مناسب ہوا کرتا ہے جس کے لئے وہ نذرانہ ہے اس لئے نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) سے پہلے اِیَّاكَ (تیری ہی) لاکر اس مقصد کو پورا کیا گیا۔ (۲) اگرچہ عبادت غذائے روحانی ہے مگر بندے پر چونکہ عبادت شاق گزرتی ہے اسلئے عبادت کی تکان کو رفع کرنے کیلئے نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) سے پہلے اِیَّاكَ (تیری ہی) لایا گیا۔ تاکہ اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں اس سے حاضری کا تصور پیدا ہو جائے کیوجہ بندے پر عبادت کا بھاری پن اسی طرح باقی نہ رہے جس طرح کسی عاشق پر مشکل ترین کام کا بار اسوقت باقی نہیں رہتا جبکہ وہ خود کو اپنے محبوب کے سامنے پاتا ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ہر چند پیرِ خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم

(۳) نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) سے پہلے اِیَّاكَ (تیری ہی) لاکر اسطرف بھی اشارہ فرمایا

گیا ہے کہ عبادت کرنے والے کو یہ چاہیئے کہ سب سے پہلے اپنے معبود کا تصور کرے کیونکہ بندگی کا یہی سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت (بندگی) تو اسطرح کرے گویا کہ تو اسکو دیکھتا ہے۔ پس اگر نہیں دیکھ سکتا ہے تو اسکو (یعنی اگر تجھکو عبادت میں ایسی حالت حاصل نہیں ہے تو یہ سمجھ کہ) بہ تحقیق وہ تجھکو دیکھتا ہے"۔ اس لئے کامل عبادت یہ ہے کہ عبادت کرنے والا اپنے معبود کے تصور میں دوسروں کو تو کیا خود اپنی ہستی کو تک بھول جائے اور یہ محویت اسلئے ناممکن اور قابل تعجب نہیں کہ انسان جب مجازی جمال کو دیکھتا ہے تو سب کچھ بھول جاتا ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کی عورتوں[1] نے دیکھا تو اتنی بیخود ہوگئیں کہ ترنج کاٹنے کے بجائے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ تو پھر اس حقیقی محبوب اور حقیقی جمال سے محویت کا کیا عالم ہوگا جبکہ اس مجازی حسن و جمال کا یہ حال ہوا۔ لہٰذا عبادت کرنے والا جب اس قسم کی عبادت کرتا ہے تو یقیناً اسکو بھی کمال محویت حاصل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایکبار آپ کے پاؤں میں تیر کھپ گیا اور پیکان ٹوٹ کر اندر رہ گئے۔ جب اس کو نکالتے تو درد کے مارے آپ بے قرار ہوجاتے۔ مگر جب

---

[1] حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کی شہرت سنکر مصر کی عورتیں آپ کا جمال دیکھنے کی خواہشمند ہوئیں مگر زلیخا کسی کو دکھلاتی نہ تھیں اسلئے ان عورتوں نے آپ کو دیکھنے کی یہ ترکیب نکالی کہ زلیخا کو ملامت کرنا شروع کیا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (یعنی اور چند عورتوں نے جو کہ شہر میں رہتی تھیں یہ بات کہی کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اس سے اپنا (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کے واسطے پھسلاتی ہے اس غلام کا عشق اسکے دل میں جگہ کر گیا ہے ہم تو اسکو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں (سپ ۱۲ ر۱۴) اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ زلیخا انکے طعن وتشنیع کو غلط ثابت کرنے ضرور حضرت یوسف علیہ السلام کی صورت انھیں دکھادیگی۔ چنانچہ انکا یہ حیلہ کامیاب ہوا اور زلیخا نے ان پر یہ ثابت کرنیکے لئے کہ واقعی یہ صورت عشق و محبت کرنیکے قابل ہے حضرت یوسف علیہ السلام کو بتلادیا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کی اس ملامت کو مکر سے تعبیر فرمایا جیسا کہ ارشاد ہے فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ یعنی پس جب اس عورت (زلیخا) نے ان عورتوں کے مکر کو سنا (پ ۱۲ ر۱۴) اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے اس عالم محویت کو بیان فرمایا ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کو دیکھنے سے انپر طاری ہوا۔ ارشاد ہے فَلَمَّا رَاَيْنَهٗ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ یعنی پس جب عورتوں نے انکو دیکھا تو (ان کے حسن و جمال کو دیکھ کر) حیران رہ گئیں اور (اس حیرت میں) اپنے ہاتھ کاٹ لئے (پ ۱۲ ر۱۴)۔

آپ نماز پڑھنے لگے تو اسی تیر کو کھینچ کر نکالا گیا لیکن آپ نماز میں ایسے مستغرق تھے کہ اس عالمِ محویت میں اسکی آپ کو خبر تک نہ ہوئی۔ مگر افسوس ہے نمازوں میں ہماری وہ محویت نہیں جو ہونی چاہیئے یہ کس قدر ناانصافی ہے کہ اللہ تعالےٰ تو بلا معاوضہ ہماری پرورش فرمائے اور ہمیشہ اسطرح ہماری حفاظت کرتا رہے جیسے کہ اسکو ہمارے سوا کوئی بندہ ہی نہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ اسکی عبادت ہم اسطرح کرتے ہیں جیسے کہ اُسکے سوائے ہمارا کوئی دوسرا پروردگار بھی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کیلئے ہمارے سوا عبادت کرنے والے بیشمار ہیں لیکن ہمارے لئے اُس وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں ؎

تُو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو پکاروں جو خفا تو ہو جائے

(۴) لفظ اِیَّاکَ (تیری ہی) کو جو ذاتِ الٰہی پر دلالت کرتا ہے نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) اور نَسْتَعِیْنُ (ہم مدد چاہتے ہیں) سے پہلے اس لئے فرمایا تا ہر عبادت کرنے والا اور مدد طلب کرنے والا محض ذات باری تعالےٰ کیلئے عبادت کرے اور وہی اسکا مقصود اصلی ہو اور صرف اسی سے مدد طلب کرے اور جس طرح اور جس وقت عبادت کریں تو اللہ تعالےٰ ہی کی کریں۔ اسی طرح جب مدد چاہیں تو صرف اللہ تعالےٰ ہی سے مدد چاہیں۔ (۵) اللہ تعالےٰ نے ہر دو مقام یعنی نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) اور نَسْتَعِیْنُ (ہم مدد چاہتے ہیں) پر لفظ اِیَّاکَ (تیری ہی یا تجھہ ہی) کو مقدم کرکے بندے کے منہ سے گویا حالتِ مشاہدہ میں یہ اقرار کروایا کہ "تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھہ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں"۔

سوال ۱۷۔ اندرون نماز ہو یا اور کسی وقت ہر مسلمان چونکہ اکیلا ہی سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے اسلئے مناسب حال تو یہ تھا کہ اس میں صیغہ واحد استعمال ہوتا۔ پھر وہ کونسی مناسبتیں ہیں جو جمع کے صیغے نَعْبُدُ (ہم سب عبادت کرتے ہیں) اور نَسْتَعِیْنُ (ہم سب مدد چاہتے ہیں) بیان کرنے میں موجود ہیں؟ **جواب**۔ وہ مناسبتیں حسبِ ذیل ہیں (۱) چونکہ وہی مستحق عبادت ہو سکتا ہے جو تربیت اور رحمت کرنے والا ہو اور سب کی حاجت روائی اور پرورش بھی فرمائے اور ایسا کرنے والا اللہ تعالےٰ ہی ہے جو ایک دو کیلئے نہیں بلکہ تمام مخلوق کیلئے کرتا ہے اسواسطے اسی کی عبادت کرنا اور اسی سے مدد چاہنا تمام جہاں پر فرض ہوا لہٰذا جمع کے صیغے بیان کئے گئے (۲) نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) اور نَسْتَعِیْنُ (ہم مدد چاہتے ہیں) کہنے والا گویا تمام بندوں کی طرف سے اس بات کی خبر دیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی بندگی کرنے والے اور اس سے مدد مانگنے والے تمام بندگان خدا ہیں۔ (۳) نَعْبُدُ (ہم سب عبادت کرتے ہیں) سے یہ ظاہر فرمایا گیا ہے کہ انسان کچھ

باہم اتفاق سے اللہ تعالےٰ کی عبادت اور اسکی بندگی میں مشغول ہونا چاہئے۔ اور خود جنگلوں میں چلے جانا اور سب سے علٰحدہ رہنا جائز نہیں ہے بلکہ یہ چاہئے کہ حتی المقدور سب کو عبادتِ الٰہی میں اپنا شریک کرے اور تارک الدنیا ہونے کا طریقہ اختیار نہ کرے اور نَسْتَعِیْنُ (ہم سب مدد چاہتے ہیں) سے اسطرف اشارہ ہے کہ سب ملکر اللہ تعالےٰ سے مدد مانگیں تا طلبِ مدد میں قوت پیدا ہو۔ (۴) دیگر اوقات میں یا بحالت نماز جب کوئی اکیلا شخص یہ سورہ پڑھتا ہے تو اسوقت ان جمع کے صیغوں کو کہنے سے اسکی یہ مراد ہوتی ہے کہ "الٰہی! فرشتوں وغیرہ کے ساتھ میں تیری بندگی کرتا ہوں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتا ہوں" (۵) چونکہ اکثر یہ سورہ فاتحہ نماز میں پڑھا جاتا ہے جیسا کہ سوال نمبر ۳ میں لکھا گیا۔ اور نماز میں جماعت مقصود ہے اسلئے نَعْبُدُ (ہم سب عبادت کرتے ہیں) لاکر یہ بتا دیا کہ سب کو ملکر عبادت کرنا چاہئے۔ جس سے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ کیونکہ جماعت کے متعدد فائدے ہیں منجملہ انکے ایک تو یہ ہے کہ جماعت سے اسلام کی شوکت و شان ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس میں ایک کو دوسرے کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ تیسرا یہ کہ ہر روز پانچ وقت نمازوں میں ملاقات سے باہم محبت پیدا ہوتی ہے چوتھا یہ کہ مسلمان ایک دوسرے کے نور ایمانی سے منور ہوتے ہیں اور سب سے بڑا فائدہ یہ کہ جس طرح کئی مسلمان اکٹھا جمع ہوں تو ان میں اللہ تعالےٰ کا مقبول بندہ ضرور رہا کرتا ہے اسی طرح نماز کی جماعت میں بھی کوئی مقبول بندہ ضرور موجود ہوتا ہے جسکے ساتھ نماز پڑھنے کی برکت سے سب کی نماز بھی ضرور مقبول ہو جاتی ہے (۶) عبادت ایک عمدہ فعل ہے جس کے لئے خلوصِ نیت اور حضورِ قلب شرط ہے جو ہر عبادت کرنے والے کو میسر ہونا مشکل ہے اسلئے جمع کا صیغہ نَعْبُدُ (ہم سب عبادت کرتے ہیں) کہکر بندہ نے اپنی عبادت کو دوسرے اچھے اور نیک لوگوں کی مقبول عبادت کیساتھ شامل کر دیا کیونکہ اللہ تعالےٰ کریم ہے نیکوں کے طفیل میں ع بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم کے مصداق عبادت بھی قبول فرما لیتا ہے ؎

می پزیرند بدان را بطفیلِ نیکاں   رشتہ وابین نگہ ہر کہ گہر می جوید

جس طرح صرف لوہے کو پانی میں ڈالا جائے تو وہ ڈوب جاتا ہے اسی طرح وہ ناقص عبادت جو تنہا ادا کیجائے اکارت ہو جاتی ہے اور وہی لوہا جب لکڑی کے ساتھ ہو مثلاً کشتی میں لگایا جائے تو پانی میں نہیں ڈوبتا ایسا ہی ناقص عبادت بھی نَعْبُدُ (ہم سب عبادت کرتے ہیں) کہنے سے دوسروں کی مقبول عبادتوں کے ساتھ ملکر ڈوبنے اور اکارت ہونے سے محفوظ ہو کر مقبول بارگاہ ہو جاتی ہے۔ یا اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے آم کی ایک ڈھیر خرید لی جس میں مرے گلے

آم بھی ہیں اور اچھے بھی اب اگر خریدار اس میں سے صرف اچھے آم چن کر لینا چاہے تو خلاف اصول ہوتا ہے اسلئے یا تو وہ سب آم واپس کر سکتا ہے یا اُسے اچھے آموں کے ساتھ خراب آم بھی لینا پڑتا ہے۔ یہاں بھی جب اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں بندہ جمع کا صیغہ نَعْبُدُ (ہم سب عبادت کرتے ہیں) کہہ کر اپنی عبادت کو سب کے ساتھ ملا دیتا ہے تو اللہ تعالےٰ جیسے کریم کے کرم سے یہ برتاؤ بہت ہی بعید ہو جاتا ہے کہ وہ تمام عبادت کرنے والوں میں سے چند کی عبادت کو ناقص ہونے کیوجہ سے رد کر دے اس لئے وہ اچھوں کی عبادت کیساتھ عیب دار اور ناقص عبادت کو بھی ضرور قبول فرمالیتا ہے (۷) اور اگر ایسا شخص نَعْبُدُ (ہم سب عبادت کرتے ہیں) کہے جسکی عبادت مقبول ہوتی ہے تو ایسی صورت میں پہلے تو یہ کہ کسی کو ہرگز یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اسوقت میری یہ عبادت مقبول ہو رہی ہے اگر بفرضِ محال اسے مان بھی لیا جائے تو بھی اس کیلئے واحد کا صیغہ اَعْبُدُ (میں ایک عبادت کرتا ہوں) کہنا اسلئے مناسب نہیں کہ اس سے عبادت کرنے والے کو یہ خیال آنا ممکن ہو جاتا ہے کہ "اللہ تعالےٰ کی عبادت کرنے والا ایک میں ہی ہوں اور میرے سوا اللہ تعالےٰ کی عبادت کوئی نہیں کرتا" جس سے اسکے دل میں خودپسندی اور غرور کے پیدا ہونیکا اندیشہ ہو سکتا تھا لہذا اس وسوسہ کو مٹانے کیلئے اَعْبُدُ (میں ایک عبادت کرتا ہوں) صیغۂ واحد کہنے کے بجائے جمع کا صیغہ نَعْبُدُ (ہم سب عبادت کرتے ہیں) بیان کیا گیا۔ تاکہ ہر کہنے والا یہ سمجھے کہ میرے سوائے بھی اللہ تعالےٰ کی عبادت کرنے والے بیشمار ہیں اور ان میں میرا کیا شمار۔ (۸) علاوہ ازیں عبادت کرنیوالے کا نَعْبُدُ (ہم سب عبادت کرتے ہیں) کہنا اسکے لئے مزید باعثِ ثواب اسلئے ہے کہ وہ گویا اس سے اپنی اور غیر کی عبادت کو ملا کر ذکر کرتا ہے۔ جس کے باعث اس نے گویا تمام مسلمانوں کی اصلاح و درستی میں کوشش کی اور جب اس نے ایسا کیا تو اللہ تعالےٰ بھی اسکی حاجت پوری کر دیتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مَنْ قَضَى لِمُسْلِمٍ حَاجَةً قَضَى اللّٰهُ جَمِيعَ حَوَائِجِهِ یعنی جو شخص کسی مسلمان کی حاجت پوری کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ بھی اسکی تمام حاجتیں پوری کر دیتا ہے۔

سوال ۲۷۔ نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں ہم عبادت کرینگے) میں گذشتہ زمانہ کی عبادت کا مفہوم موجود نہیں ہے۔ کیونکہ یہ فعل مضارع (موجودہ اور آئندہ زمانہ کو شامل) ہے اسلئے بجائے اسکے ماضی (گزرے ہوئے زمانہ) کا صیغہ عَبَدْنَا (ہم سب نے عبادت کی) اگر کہا جاتا تو کیا قباحت تھی؟ **جواب**۔ بندہ جب عبادت کرتا ہے تو گویا وہ دربار الٰہی میں حاضر ہوتا ہے اور

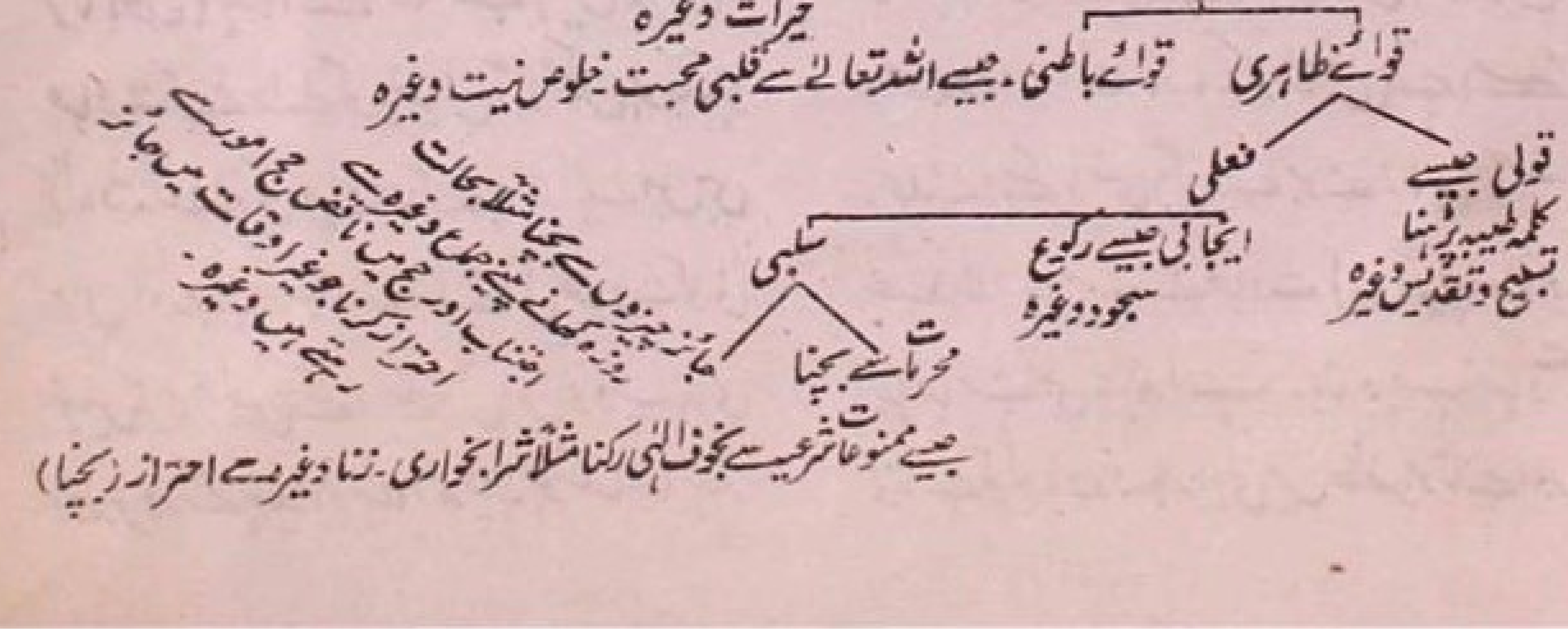
حضوری کا مقام یہ چاہتا ہے کہ اُسوقت بھی عبادت کیجائے اور آئندہ کیلئے بھی عبادت کا عہد کیا جائے چونکہ یہ مفہوم صیغہ مضارع (مشتمل برزمانۂ موجودہ و آئندہ) میں ہی پایا جاتا ہے نہ کہ ماضی (گذرے ہوئے زمانہ کے صیغہ) میں اسلئے اس مناسبت کے مدنظر فعل ماضی عَبَدْنَا (ہم نے عبادت کی) کے بجائے فعلِ مضارع نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں۔ ہم عبادت کرینگے) بیان کیا گیا۔

سوال ۳۷۔ عبادت کسے کہتے ہیں؟ **جواب۔** مفسرین نے عبادت کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "عبادت نہایت درجہ کی عاجزی اور ذلت کو کہتے ہیں"۔ چنانچہ عربی میں ایسے راستہ کو مَعْبَدْ کہا جاتا ہے جس پر سے بکثرت لوگ چلتے ہوں جس سے وہ پاؤں میں روندا جاکر چونکہ ذلیل ہوتا ہے اسلئے ایسے فعل کو بھی عبادت کہا جاتا ہے ....

.... جس سے بندہ اپنے معبود کے سامنے اظہار ذلت وانکساری کرتا ہے۔ بعضوں نے کہا کہ "عبادت اس فعل کو کہتے ہیں جس میں غیر کی تعظیم ہو"۔ کسی نے کہا کہ "عبادت اس تابعداری کو کہتے ہیں جس میں ذلت اور عاجزی ہو"۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ "قرآن مجید میں جہاں عبادت کا ذکر آیا ہے اسکے معنی توحید کے ہیں"۔ پس اس بناپر یہاں نَعْبُدُ کے معنی نُوَحِّدُ (ہم تجھے ایک کہتے ہیں) کے ہوئے بعضوں نے کہا کہ "غیر اللہ سے روگردانی کرکے بارگاہِ قدس کیطرف جانا عبادت ہے"۔ کسی نے کہا کہ "تعظیم کی انتہائی نوعیت کو ادا کرنا عبادت ہے"۔ اور اسکی شرع میں کئی قسمیں ہیں جنکا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے۔

عبادت کی قسمیں

عبادتوں میں سے چند کا تعلق قوائے ظاہری سے ہے اور چند کا تعلق اندرونی قوتوں سے۔ لیکن ہر ایک کو (خواہ وہ ظاہری اعضا ہوں یا اندرونی قوتیں سب کو) اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور اسکی رضامندی میں مشغول کردینے کا نام عبادت ہے جس کی توضیح نقشہ ذیل سے کیجاتی ہے:۔



ارکان اسلام کی جامعیت

اسلام کے پانچ ارکان (۱) کلمہ پڑھنا (۲) نماز (۳) زکواۃ (۴) روزہ (۵) حج میں متذکرۂ بالا ہر قسم کی عبادات شامل ہیں۔ وہ اس طرح کہ صرف قولی عبادت کلمۂ طیبہ پڑھنا ہے جو مسلمان ہونے کیلئے ضروری ہے۔ اور صرف فعلی عبادت جس میں قول کو کچھ دخل نہیں روزہ ہے۔ اور صرف مالی عبادت جس میں نہ قول کو دخل ہے نہ فعل کو وہ زکواۃ ہے۔ اور ایسی عبادت جس میں قول و فعل دونوں موجود ہوں وہ نماز ہے۔ اب رہی ایسی جامع عبادت جس میں یہ تمام اقسام شامل ہوں وہ حج ہے۔ کیونکہ حج کیلئے مال خرچ کرنا پڑتا ہے اسلئے مالی ہے اور بدنی عبادت اسطرح سے ہے کہ حج میں بھی نیت کا درست ہونا ضروری ہے جو قوائے باطنی سے متعلق ہے۔ اور مناسک حج کی ادائی میں قوائے ظاہری (یعنی ہاتھ پاؤں وغیرہ) کو کام میں لانا پڑتا ہے اور قولی عبادت لبیک وغیرہ کہنا بھی اس میں ہے تو فعلی عبادت بھی ہے۔ چنانچہ ایجابی افعال جیسے کعبہ کا طواف کرنا۔ عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو ٹھیرنا وغیرہ اسی طرح سلبی افعال بھی موجود ہیں کیونکہ اس میں ناجائز امور سے بچنا تو کجا خود جائز افعال مثلاً سر منڈھانا۔ جماع کرنا وغیرہ سے اجتناب ضروری ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جو ان تمام اقسام عبادات کا مجموعہ ہے جسے ایک سچا بندہ اپنی ہر قسم کی توانائی کو کام میں لاکر رضائے الہٰی کی خاطر الگ الگ طور پر انجام دے سکتا ہے۔

انسان کا بلند ترین مقام

عبادت ہے. جو بظاہر اگرچہ نہایت درجہ عاجزی و ذلت ہے لیکن درحقیقت کمال عزت و تجمل ہے اور تخلیق کا مقصد بھی جیسا کہ باری تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ یعنی اور میں نے جن و انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں (پ۲۷ ر۲) اور چونکہ عبادت بندے کو اللہ تعالےٰ سے منسوب بھی کرتی ہے اسلئے یہ سب سے بلند تر مقام ہے۔ اور اس سے بندہ کو شرف و اعزاز حاصل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول مقبول سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ ترین جو مقام عطا فرمایا ہے وہ "مقام عبدیت" ہے چنانچہ نزول قرآن کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر عَبْد (بندہ ہی کے نام سے فرمایا ہے ارشاد ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ یعنی سب تعریف اللہ ہی کے واسطے ہے جس نے اپنے (خاص) بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی (پ۱۵ ر۱۳) اسی طرح معراج کے سلسلہ میں بھی آپ کا ذکر عبدیت ہی کے ساتھ کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے سُبْحٰنَ الَّذِىْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ

لَيۡلًا" یعنی وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندہ (محمدؐ) کو لے گیا رات کے کچھ حصہ میں (پ۱۵ ر۱)۔

اس سورۂ فاتحہ میں دو مقام ہیں ایک ربوبیت کی معرفت کا دوسرا عبودیت کی معرفت کا۔ چنانچہ ابتدائے سورہ سے مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ (مالک ہے بدلہ کے دن کا) تک اللہ تعالےٰ کی ازلی ربوبیت (یعنی مبدا) سے قیامت (یعنی معاد) تک کی ربوبیت کا ذکر ہے۔ اسکے بعد اِيَّاكَ نَعۡبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) میں مقام عبودیت کی ابتدا ہے تو وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ (اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) میں بندگی کے کمال کا بیان ہے اور جب یہ دو مقام جمع ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالےٰ کے ساتھ بندہ کا معاملہ تمام ہو جاتا ہے۔

اور مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ (مالک ہے بدلہ کے دن کا) کے بعد اِيَّاكَ نَعۡبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) میں عبادت کے ذکر کو قیامت کے ذکر کے ساتھ بیان کرنے سے عبادت کرنے والوں کو یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ جو شخص جس غرض سے عبادت کریگا اسکا نتیجہ يَوۡمِ الدِّيۡنِ (بدلہ کے دن یعنی قیامت) میں معلوم ہوگا۔ کیونکہ عبادت کرنے والے اپنی اپنی الگ غرض رکھتے ہیں۔ (۱) کوئی اسلئے عبادت کرتا ہے کہ اسکا ثواب حاصل کرے (۲) بعض عذاب الٰہی سے ڈر کر عبادت کرتے ہیں (۳) اور اعلیٰ درجہ رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو محض اللہ تعالےٰ کیلئے اور اسکی خوشنودی کیلئے عبادت کرتے ہیں[1] الغرض جس مقصد کیلئے بھی عبادت کیجائے اس کا تعلق روز جزا سے ہی ہے۔

سوال ۴۷۔ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ

(تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کے معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے لفظی رد و بدل کے ساتھ مثلاً (۱) اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ نَسۡتَعِيۡنُ یا (۲) وَلَكَ نَعۡبُدُ اور (۳) اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَبِكَ نَسۡتَعِيۡنُ یا (۴) وَلَا نَعۡبُدُ اِلَّا اِيَّاكَ اور (۵) اِيَّاكَ عَبَدۡتُ یا اِيَّاكَ عَبَدۡنَا اگر بیان کیا جاتا تو بتائیے کہ مفہوم میں کیا تغیر پیدا ہوتا اور ان سے کیا قباحتیں رونما ہوتیں؟ **جواب**۔ اگر اِيَّاكَ (تیری) مکرر نہ لایا جاکر صرف (۱) اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ نَسۡتَعِيۡنُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور ہم مدد چاہتے ہیں) کہا جاتا تو اس سے یہ گمان ہوتا کہ مدد طلب کرنا صرف عبادت کے ساتھ ہے لہٰذا نَسۡتَعِيۡنُ (ہم مدد چاہتے ہیں) سے پہلے بھی مکرر اِيَّاكَ (تجھ ہی) لاکر دونوں کو الگ کرکے یہ بتلا دیا کہ استعانت (مدد طلب کرنا) صرف اللہ تعالےٰ

---

[1] چنانچہ اسی وجہ سے نماز کی نیت میں اُصَلِّيۡ لِلّٰهِ تَعَالٰى (میں اللہ تعالےٰ کی نماز پڑھتا ہوں) کہنے کی تعلیم دیگئی ہے یوں نہیں فرمایا گیا کہ نیت نماز میں اسطرح کہو کہ "میں اللہ تعالےٰ سے ثواب ملنے کی نیت سے نماز پڑھتا ہوں یا عذاب الٰہی سے نجات پانے یا یہ کہ بزرگی حاصل کرنے نماز پڑھتا ہوں وغیرہ" جس سے ثابت ہوا کہ مقصد عبادت صرف ذات باری تعالیٰ ہونا چاہیے ۱۲ (از مولف)۔

کے فضل ہی سے ہے اور (۲) وَلَكَ نَعْبُدُ (اور تیرے لئے ہم عبادت کرتے ہیں) اگر کہا جاتا تو اس سے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ بندہ کی عبادت میں اللہ تعالےٰ کو کچھ نفع بھی ہوتا ہے کیونکہ عربی میں لام نفع کیلئے آتا ہے اور (۳) اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَبِكَ نَسْتَعِیْنُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تیرے ذریعہ سے ہم مدد چاہتے ہیں) اگر کہا جاتا تو اس سے یہ مفہوم ہوتا کہ بندہ نے اللہ تعالےٰ کو اپنے اور اپنے مطلوب کے درمیان ایک واسطہ بنایا ہے جو شان الٰہی کے خلاف ہوتا۔ اور (۴) وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاكَ (اور ہم عبادت نہیں کرتے مگر تیری) میں "لا" حرف نفی اسلئے ناموزوں تھا کہ یہ سورہ سورۃ المناجات ہے (جیسا کہ سوال نمبر ۳۰ میں بیان کیا جا چکا ہے) اور مناجات میں منفیات کی طرف زیادہ توجہ مناسب نہیں بلکہ مناجات میں تو نمازی کیلئے اپنے مقصد کو ثابت کرنے والے الفاظ کا ہونا بہت موزوں ہوتا ہے (۵) اِیَّاكَ عَبَدْتُ (تیری ہی میں نے عبادت کی) یا اِیَّاكَ عَبَدْنَا (تیری ہی ہم نے عبادت کی) بھی اسلئے نہیں کہا گیا کہ یہ دونوں فعل ماضی ہیں جس کے کہنے سے یہ وہم ہوتا تھا کہ بندہ جب کہہ رہا ہے کہ "ہم نے زمانہ گذشتہ میں عبادت کی" تو اب عبادت سے فارغ ہو چکا ہے اسلئے آیندہ عبادت ترک کر دیگا۔ لہذا معلوم ہوا کہ انمیں سے کوئی جملہ معنوی لحاظ سے اتنا بہتر اور موزوں نہیں ہے جتنا کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) ہے۔

سوال ۷۵۔ جب اللہ تعالےٰ غنی ہے اور اسکو ہماری عبادت کی پروا نہیں تو پھر اللہ تعالےٰ کی عبادت کیلئے مشقت برداشت کرنا ہمارے لئے کیوں ضروری ہوا ہے؟ **جواب**۔ اللہ تعالےٰ اپنی ذات وصفات اور اپنے افعال کے کمال کے لحاظ سے اور اسلئے کہ وہ ہر قسم کے نقصان سے مبرا ہے اس امر کا خود مستحق ہے کہ تمام موجودات جو نقص سے مبرا نہیں ہیں وہ اسکے آگے عاجزی کے طور پر اور اپنے کو ذلیل قرار دیکر اسکی بیحد تعظیم کریں جسے عبادت کہتے ہیں۔ جیسا کہ ہر کمال والا اس کا مستحق ہوتا ہے کہ اسکے مقابل میں نقص والے کیطرف سے عاجزی کا اظہار ہو ورنہ نقص والے اور کمال والے میں مساوات ہو جائیگی جو عقلاً درست نہیں۔ پس اگرچہ اللہ تعالےٰ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں ہے لیکن ہم چونکہ اسکے محتاج ہیں اس واسطے اپنے فائدے کیلئے اللہ تعالےٰ کی رضا جوئی کے طور پر عبادت کرنا ہمارے لئے بے فائدہ مشقت نہیں بلکہ ازروئے حکمت وہ ہمارے فرائض میں داخل ہے

سوال ۷۶۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) کے بعد وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) لانے میں کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں؟ **جواب**۔ (۱) بندہ نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) کہہ کر اپنی طرف عبادت

کی نسبت ہونے سے کہیں خود کو بالکل مختار سمجھ کر غرور نہ کرے اسلیئے ساتھ ہی اسکے بعد وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) لایا گیا تاکہ اس سے بندہ کا محتاج بھی ہونا ثابت ہو (۲) اور یہ کہ اللہ تعالےٰ سے بندہ گویا اس طرح کہہ رہا ہے کہ "اے خدا! ہم تیری کمزور[1] مخلوق ہیں اسلیئے تیری مدد کے محتاج ہیں تو ہماری مدد کر کیونکہ تیری عبادت کرنا تجھ سے مدد طلب کیئے بغیر ممکن نہیں"۔ (۳) اس سے یہ سبق بھی دیا گیا ہے کہ ہر انسان کو عبادت اور دینداری کا ارادہ کر کے اسمیں کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ انسان کو اللہ تعالےٰ نے ارادہ کرنیکی قوت عطا فرمائی ہے۔ اور نَسْتَعِیْنُ (ہم مدد چاہتے ہیں) سے اسطرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ انسان ارادہ کرنے کے بعد بھی اللہ تعالےٰ کی مدد کا ضرور محتاج ہے۔

شبہہ:- یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب عبادت کرنا مقدر میں رہے تو اسکے ساتھ مدد الٰہی بھی خود ہو جائیگی پھر اسکے باوجود نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) کہنے کے بعد نَسْتَعِیْنُ (ہم مدد چاہتے ہیں) کہنے کے کیا معنی؟ **جواب**۔ اللہ تعالےٰ کی مدد اسی کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالےٰ کی بارگاہ سے مدد چاہتا ہے اور یہ مدد طلب کرنا اسی طرح بطور عادت ہے جس طرح ان اسباب کو بطور عادت انسان فراہم کرتا ہے جن سے اسکو روزمرہ کام پڑتا ہے جیسے پیٹ بھرنے کیلیئے غذا کھانا تشنگی (پیاس) رفع کرنے کیلیئے پانی پینا وغیرہ۔ پس پیٹ بھرنا مقدر میں ہونیکے باوجود جس طرح غذا کھائی جاتی ہے اور پیاس دفع ہونا مقدر میں رہے بھی تو پانی پینا جس طرح لازمی ہے ویسا ہی عبادت مقدر میں ہونیکے باوجود مدد طلب کرنا بھی لازمی ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے بطور عادت ان چیزوں کو مطلوب کے حاصل کرنے کا واسطہ بنا دیا ہے۔

سوال ۷۷۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) میں عبادت کو مقدم کر کے اسکے بعد وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) لا کر مدد طلب کرنے کو کیوں موخر کیا گیا حالانکہ مدد طلب کرنا عمل سے پہلے ہونا چاہیئے نہ کہ عمل (عبادت) کے بعد؟ **جواب** (۱) جسطرح بادشاہوں کے پاس پہلے تعظیم بجا لا کر اور نذرانہ پیش کر کے پھر عرض حال کیا جاتا ہے اسی طرح خدا تعالےٰ کے حضور میں عبادت کو پیش کرنے کے بعد مدد طلب کیگئی ہے۔ اگرچہ ان دنیوی بادشاہوں کو اللہ تعالےٰ سے کچھ بھی مناسبت نہیں مگر عقل سلیم یہی کہتی ہے کہ ہدیۂ عبادت کو پیش کرتے ہوئے عبودیت کا اظہار کرنیکے بعد اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل ہونے پر وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کہہ کر سوال کرنے کا طریقہ ہی درست اور بہتر ہے۔ (۲) استعانت (مدد طلب کرنا) گویا ایک سوال اور مطلب ہے

---

[1] چنانچہ قرآن مجید میں بھی ہے وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ۰ یعنی اور آدمی کمزور پیدا کیا گیا ہے (پ ۵ ر ۲) از مولف۔

جس کے پہلے از روئے قاعدہ کسی وسیلہ کا پیش کرنا ضروری ہوتا ہے اسلئے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) سے پہلے اِیَّاکَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) لاکر اشارۃً یہ بتا دیا کہ استعانت (مدد طلب کرنے) کے لئے عبادت وسیلہ ہوتی ہے۔ (۳) چونکہ بعض نفوس میں عبادت الٰہی کے بعد ایک طرح کی خود پسندی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے اسلئے اسکی اصلاح نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) کے بعد وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کے بیان سے کی گئی ہے۔ کیونکہ ہر بندہ کو اس سے یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ وہ جو بھی عبادت کرتا ہے اللہ تعالےٰ کی مدد اور اسی کی اعانت شامل ہونے کی وجہ سے کرتا ہے۔ (۴) نَسْتَعِیْنُ (ہم مدد چاہتے ہیں) کو جو گویا ایک سوال ہے نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) کے بعد لاکر یہ بتلایا گیا ہے کہ سوال کرنے سے پہلے عبادت کرنی لازم ہے۔

سوال ۸۷۔ جب بندہ کو اللہ تعالےٰ نے اپنے ارادہ سے کام کرنے کی قدرت عطا فرمائی ہے تو پھر اللہ تعالےٰ سے مدد مانگنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ **جواب**۔ اللہ تعالےٰ نے بندہ کو بظاہر جو قدرت والا بنایا ہے اسکے سبب سے بندہ جو کام کرتا ہے اس میں اسکا یہ گمان ہو جاتا ہے کہ اس کام کو کرنا یا نہ کرنا صرف میرے ہی ہاتھ میں ہے حالانکہ اسکا یہ خیال اسلئے غلط ہے کہ بارہا یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان اپنے معاملات میں اپنی عقل و قدرت اور سمجھ و شعور کو پوری طرح کام میں لانے کے باوجود کبھی اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا ہے تو کبھی نامراد بھی ہو جاتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی طاقت کے پیچھے کوئی دوسری زبردست قوت بھی ضرور کارفرما ہوتی ہے جسے ہم مشیت الٰہی کہتے ہیں اسلئے مرد مومن اللہ تعالےٰ کی دی ہوئی عقل و قدرت کو کام میں لاکر ارادہ کرنیکے بعد بھی اپنے کام میں اسلئے اللہ تعالےٰ سے مدد مانگتا ہے کہ حصول مقصد کیلئے کسی ایک کام پر دوسرے کام کو ترجیح کے قابل بنانا صرف اسی حقیقی محرک و متصرف ذات باری تعالےٰ ہی کا کام ہے۔ لہذا عمل پر مدد الٰہی طلب کرنیکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تائید غیبی شامل حال ہو جائے۔

سوال ۸۹۔ نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) اور نَسْتَعِیْنُ (ہم مدد چاہتے ہیں) کو ساتھ ساتھ بیان کرنے میں کس طرف اشارہ ہے؟ **جواب**۔ (۱) اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ مدد اسی سے چاہنا چاہئے جسکی عبادت کرتے ہیں کیونکہ معبود میں پیدا کرنے اور پالنے وغیرہ کے علاوہ ہر طرح کی قدرت اور اختیار کا ہونا بھی ضروری ہے (۲) اس سے یہ بھی ظاہر فرمایا گیا ہے کہ معبود حقیقی کی عبادت کرنا اور اسی سے مدد مانگنا دونوں لازم و ملزوم ہیں (۳) اسطرف بھی ایک لطیف اشارہ ہے کہ مدد طلب کرنے ہی سے عبادت کا تکملہ ہوتا ہے کیوں کہ

دراصل عبادت اسی صورت میں پائی جاتی ہے جبکہ ہمہ تن عجز وانکساری کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے۔ اور جب ایسی حالت پیدا ہوجاتی ہے تو عبادت کرنیوالے میں اور معبود میں ایک روحانی ربط پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی واسطے ہر عبادت کے ساتھ دعا کرنا اسلام میں لازم قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ" یعنی دعا عبادت کا گودا (مغز) ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ دعا کے بغیر عبادت محض ایک چھلکا ہے۔ دوسری حدیث ہے کہ "جو شخص دعا نہیں کرتا اسپر اللہ تعالےٰ کا غصہ بھڑکتا ہے"۔ الغرض دعا سے بندہ اور اللہ تعالےٰ کے درمیان واسطہ اور رابطہ تازہ ہوتا ہے۔ (۴) اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عبودیت کا مرتبہ دو طرح سے کامل ہوتا ہے ایک تو عبادت کرنے سے دوسرے یہ کہ اپنے کو اللہ تعالےٰ کا محتاج محض سمجھ کر اُسی سے ہر کام میں مدد مانگنے سے۔ اگر کوئی عبادت کرے مگر اللہ تعالےٰ سے مدد نہ چاہے تو وہ اُن خادموں کی طرح ہے جو اپنے آقا کی خدمت گزاری تو برابر کرتے ہیں مگر اس سے اپنی حاجات کا اظہار نہیں کرتے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ گویا اپنے غرور و نخوت کا ثبوت دیتے ہیں اور خود کو اپنے آقا کا محتاج نہیں سمجھتے جس کی وجہ انکا آقا ان سے ناراض ہوتا ہے تو پھر ایسا خدائے پاک جو بندوں کو اپنے سے مانگنے کا حکم دیتا ہے (جیسا کہ قران مجید میں ہے وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ○ یعنی اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری درخواست قبول کرونگا۔ جو لوگ (صرف) میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب (مرتے ہی) ذلیل ہوکر دوزخ میں داخل ہونگے (پ۲۴ ر۱۱) اور وہ معبود جو ایسا کریم و سخی ہے کہ دینے سے کبھی بیزار نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہے) ضرور ایسے بندوں سے خفا ہوتا جو صرف اِیَّاكَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) کہتے اسلئے اسکے بعد ہی وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) بیان کیا تا یہ ثابت ہو کہ بندے اللہ تعالےٰ سے امداد بھی طلب کرتے ہیں۔

سوال ۸۰۔ ذکر عبادت کے بعد اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کہنے سے کیا صرف عبادت کیلئے مدد طلب کرنا مقصود ہے یا اس سے دین و دنیا کے تمام امور میں بھی اللہ تعالےٰ سے مدد طلب کرنے کی تعلیم دیگئی ہے؟ **جواب۔** یہاں دونوں مطلب ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ بندہ ہر وقت اللہ تعالےٰ کی مدد کا محتاج ہے خواہ عبادت کی حد تک ہو یا دیگر کاموں کیلئے۔ اور ہر عمل اگرچہ بندے کے کسب کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن بندہ ہر کام سے پہلے چونکہ اسکا شعور نہیں رکھتا کہ آئندہ وہ کیا عمل کرنے والا ہے نہ اس سے آگاہ رہتا ہے کہ وہ واقع ہونے والا عمل اس کیلئے مفید ہوگا یا مضر۔ اسلئے بندے کو چاہئے کہ اللہ تعالےٰ

سے ہر موقع پر مدد طلب کرتا ہے تا وہ اپنی مدد سے بندے میں اچھے کام (مثلاً عبادت یا دیگر دینی امور اور وہ دنیوی امور جو دینی لحاظ سے مفید ہوں) کو اختیار کرنے کا شعور پیدا فرمائے اور اس سے آگاہی بخشے کہ ان میں سے کونسا عمل اس کے حق میں مفید ہے اور کون سا مُضر۔ اور مُضر سے بچائے مفید کام کے خیال کو دل میں ڈال کر ایسا مستحکم فرمادے کہ پھر وہ دل سے کبھی نہ نکلے۔ اگرچہ عقلِ انسانی بھی اچھے بُرے کی تمیز کرتی ہے مگر اُسے بھی ہدایت دے کر اس طرح تمیز کرنے والا بنانا اللہ تعالیٰ ہی کی مدد شاملِ حال رہنے کے بعد ہوتا ہے۔ اور انسان کو جب کسی عمل کا خیال پیدا ہوتا ہے تو ہدایت یافتہ عقل اور نفس میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ عقل دُنیا و دین کے اچھے کام کو جس میں اگرچہ فی الحال کے مشقتیں ہوں تو بھی کرنا چاہتی ہے۔ بہ خلاف اس نفس بُرے کام اور ہر ایسے کام کو کرنا چاہتا ہے جس میں فی الحال نفع ہو خواہ اس کا انجام کتنا ہی نقصان پہنچانے والا ہے لہذا خواہشاتِ نفسانی کے غلبے کو دفع کرنے اور عقل کو نیک و بد میں تمیز کرنے والی بنا کر نفس پر غالب بنانے کے لیے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کہہ کر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

بعض سلف نے کہا ہے کہ قرآنِ مجید کا بھید سورۂ فاتحہ میں ہے اور سورۂ فاتحہ کا بھید دو کلموں میں ہے۔ کیونکہ پہلا کلمہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) میں شرک سے بیزاری ہے اور دوسرے کلمے۔ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) میں اللہ تعالیٰ کو اپنا ہر کام سونپنا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں بھی اکثر اسی کی تاکید فرمائی گئی ہے جیسے قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا یعنی آپ کہیے کہ وہ بڑا مہربان ہے ہم اس پر ایمان لائے اور اس پر ہم بھروسہ کرتے ہیں (پ ۲۹ ر ۲) دوسری جگہ ارشاد ہے رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ یعنی وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں تو اُسی کو اپنے کام سپرد کر دینے کے لیے قرار دے ہو (پ ۲۹ ر ۱۳) اور ایک جگہ قرآنِ مجید میں ہے وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ یعنی اور آسمانوں اور زمین میں جتنی غیب کی باتیں ہیں ان کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور سب کام اسی کی طرف رجوع ہوں گے پس عبادت کر اُسی کی اور اُسی پر بھروسہ رکھ (پ ۱۲ ر ۱)

سوال ۱۸۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) سے کن عقائد کا رد ہوتا ہے؟

جواب۔ فرقۂ جبریہ اور فرقۂ قدریہ کے عقائد کا رد ہوتا ہے۔ چنانچہ فرقۂ جبریہ اس امر کا قائل ہے کہ "ہم کو کچھ بھی اختیار نہیں ہے

اور لکڑی پتھر کی طرح ہم بالکل بے اختیار ہیں اور اسی بے اختیاری کے ساتھ ہم سے حرکات سرزد ہوتی رہتی ہیں۔" پس اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) سے فرقہ جبریہ کا رد اس طرح فرمایا گیا کہ اس میں عبادت کرنے کے فعل کو بندے کی طرف سے ثابت کیا گیا ہے۔ اگر بندہ ان کے عقیدے کے لحاظ سے بالکل مجبور ہوتا تو نَعۡبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) کہنا غلط ہوتا۔ اور جب ایسا کہا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ عمل بندے کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ بالکل مجبور نہیں۔ فرقہ جبریہ کا ایسا عقیدہ اس لیے بھی غلط ہے کہ اس سے تمام تکلیفاتِ شرعیہ (یعنی ایمان اور نیک عمل کی ترغیب اور اللہ تعالیٰ اور رسول کے سب احکام) مہمل ثابت ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ان کی تلقین اسی طرح غلط قرار پاتی ہے جس طرح کسی شخص کا پتھر لکڑی کو کسی عمل کی ہدایت کرنا مہمل سمجھا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے فرقہ قدریہ کہتا ہے کہ "بندوں کو ہر طرح کا اختیار حاصل ہے اور ہمارے افعال حرکات کی ایجاد ہم ہی کرتے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کو بالکل دخل نہیں" جسے اللہ تعالیٰ نے وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) سے اس طور پر رد فرمایا ہے کہ اگر بندہ بالکل مختار ہوتا تو پھر اسے مدد مانگنے کی ضرورت نہ ہوتی جب اللہ تعالیٰ سے بندوں کو مدد مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے تو معلوم ہوا کہ بندے اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں اور بالکل مختار نہیں ہیں اور ان کا یہ عقیدہ اس لیے بھی غلط ہے کہ بندوں کو اگر اپنے افعال کا مختارِ کل قرار دیا جائے گا تو بندے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا مجبور ہونا اور خالقیت (پیدا کرنے) میں غیرِ خدا کے دخل کو تسلیم کرنا پڑے گا جو صریحاً غلط ہے۔ پس اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) سے جو درمیانی عقیدہ ثابت ہوتا ہے وہی ہم اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ اور وہ یہ کہ بندہ نہ بالکل مختارِ کل ہے نہ بالکل مجبور ہے

نہ مجبور بندہ نہ مختار ہے
میانہ ہی پن یاں سزاوار ہے

نوٹ۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے شائقینِ کرام مکمل طور پر اگر اس کو سمجھنا چاہتے ہیں تو میری کتاب "اثباتِ تقدیر" کا مطالعہ فرمائیں جس میں مسئلہ تقدیر کے ہر پہلو کو آیاتِ قرآنی کی روشنی میں تشفی بخش طریقے پر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سوال ۸۲۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کتنے طریقوں سے ہوا کرتی ہے؟ **جواب**۔ اس کے متعدد طریقے ہیں منجملہ ان کے (۱) دل میں کسی کام کا ارادہ پیدا کر دینا (۲) پھر اس کام کو انجام دینے کی قدرت عطا کرنا (۳) اور اس کی اچھائی اور نتیجے کی خوبی کو دل پر اس طرح نقش کر دینا جس سے انسان اس کی طلب میں مستعد ہو جائے (۴) پھر کسی کام

کے لیے آلات (مثلاً عقل و شعور ہاتھ پاؤں وغیرہ) سے نواز کر کے اسباب وغیرہ کو فراہم کرنا تاکہ اس کی وجہ وہ کام انجام پا سکے۔ پھر یہ فراہمی اسباب دو طرح پر ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جس کے بغیر کام تمام نہ ہو بلکہ بقدرِ ضرورت ہو جیسے صرف پیٹ بھرنے کے لیے اسباب کا مہیا ہونا خواہ عمدہ غذا سے پیٹ بھرے یا ناقص غذا سے دوسرے یہ کہ ایسے اسباب فراہم کئے جائیں جس سے زائد از ضرورت چیزیں میسر ہوں جیسے پیٹ تو بھرے لیکن عمدہ اور بہتر غذا سے اور اسی کو **استطاعت** بھی کہتے ہیں۔ اس طرح کے اسباب اور ساز و سامان کی فہرست بہت طویل ہے جس میں حواسِ ظاہری و باطنی کی سلامتی اور صحت و تندرستی کا قائم رہنا وغیرہ بھی شامل ہے (۵) کام میں خلل پیدا کرنے والی چیزوں کو دور کرنا کیونکہ یہ بھی مدد میں اس لیے شامل ہے کہ کسی کام کا پختہ ارادہ ہو اور اس کے اسباب بھی فراہم ہوں لیکن جب اس کی رکاوٹیں رفع نہ ہوں تو وہ کام کبھی انجام نہیں دیا جا سکتا۔ (۶) اور جو کام کیا جائے اس کے نتیجہ کا بھی برآمد ہونا مدد ہی کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ پھر جب کسی کام کا نتیجہ اپنی مرضی کے موافق برآمد ہوتا ہے تو اسے **برکت** کہتے ہیں۔ اور ہر کام میں برکت کے حصول کے لیے اسلام نے یہ بتلا دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کیا جائے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ حصولِ مقصد کے لیے کسی کام میں اللہ تعالیٰ کا نام لینا فائدہ مند نہیں بلکہ صرف اسباب کا فراہم ہونا ہی کافی ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ سے اپنی محتاجی کو تسلیم نہیں کرتے ہیں جو صریحاً گمراہی ہے۔

اگرچہ عادتِ الٰہی یوں ہی جاری ہے کہ (۱) اسباب کے فراہم ہونے اور (۲) رکاوٹوں کے دفع ہونے کے بعد ضرور کام کا نتیجہ رونما ہو جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے جب چاہتا ہے تو ان دونوں کے ہوتے ہوئے بھی کسی کام کو بے نتیجہ فرما دیتا ہے اور بندہ ہزار کوششیں کرنے پر بھی مراد کو نہیں پہنچتا۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "میں نے اپنے رب کو میرے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا"۔ کیونکہ بندہ ہی اگر اپنے فعل کا مختار ہوتا تو اس کا ہر ارادہ ضرور پورا ہو کے رہتا۔ جب ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ دراصل فاعلِ حقیقی وہ ہے جس کی صفت "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ" (جو کچھ چاہے اس کو پورے طور سے کر سکتا ہے) (پ ۱۲ ر ۹) ہے۔ یوں اسباب اگرچہ اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں مگر وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے۔

فضلِ رب کو کب سبب درکار ہے
بے سبب دینا اُسے کب بار ہے

چنانچہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت بتلانے رکاوٹوں کی موجودگی میں اسباب کے نہ ہوتے کے باوجود اثرات کو مرتب فرما دیتا ہے جیسے دریا میں

(حاشیہ بعد کے صفحہ پر)

خشک راستہ کا بن جانا۔ اور خشک ترین چیز
پتھر[1] میں سے پانی کے چشمے اُبل پڑنا اور اس کے
برعکس بعض اوقات جبکہ کوئی رکاوٹ نہیں رہتی
اور اثر کے لیے تمام اسباب بھی موجود ہوتے ہیں
پھر بھی اس کا اثر مرتب نہ ہونے دینا جیسے آگ[2] کا
نہ جلانا۔ بے سروسامان مختصر[3] فوج کا بڑے لشکروں
کو شکست دینا۔ غرض اور اس قسم کے غیر متوقع
کام جب بندوں کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں تو خرقِ
عادت کہلاتے ہیں۔ پھر یہ خرقِ عادت امور
اگر بدکاروں سے ظاہر ہوں تو اسے استدراج
کہتے ہیں جیسا کہ سامری نے فرعونیوں کے زیورات
کو گلا کر ایسا بچھڑا بنایا جو دھات سے بنا ہوا تھا
مگر اس میں سے آواز نکلنے لگی جس کی وجہ سے
اُس بچھڑے کو خدا کہا جانے لگا۔ اور نیکوں سے
ظاہر ہو تو اگر وہ نبی ہیں تو اسے معجزہ کہتے ہیں
جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدہا بننا
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے سے چاند
دو ٹکڑے ہو جانا وغیرہ۔ اور جب غیر نبی سے ظاہر
ہو تو کرامت کہتے ہیں جیسا کہ حضرت مریم
علیہا السلام کے پاس بے موسم کا میوہ پایا
جانا۔

سوال ۸۳۔ غیر اللہ سے مدد مانگنا کس حد تک

لہ حاشیہ ما قبل جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ یعنی جبکہ شق کر دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو (پ ۱ ر ۶)
دوسری جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہے فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا یعنی پھر ان کے لیے دریا میں
عصا مار کر خشک راستہ بنا دینا (پ ۱۶ ر ۱۳)

[1] قرآن مجید میں ہے فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا یعنی ہم نے (موسیٰ کو) حکم دیا کہ اپنے اسی عصا (لاٹھی) کو فلاں پتھر پر مارو پس فوراً اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے (پ ۱ ر ۷)۔

[2] چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ○
یعنی ہم نے (آگ کو) حکم دیا کہ اے آگ تو ٹھنڈی اور بے ضرر ہو جا ابراہیم کے حق میں (پ ۱۷ ر ۵)

[3] اللہ تعالیٰ ایمان داروں کا قول فرماتا ہے۔ وَقَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ
قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ط یعنی ایسے لوگ جن کو یہ خیال تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش
ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ ایسا بہت ہوا ہے کہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے غالب
آگئی ہیں (پ ۲ ر ۱۷) چنانچہ غزوہ بدر میں مسلمان مختصر تعداد میں بے سروسامان اور کمزور تھے مگر کافروں کے کثیر اور
قوی لشکر پر انہیں فتح دی گئی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ ج یعنی البتہ
تحقیق اللہ تعالیٰ نے بدر میں تم کو مدد دی حالانکہ تم بے سروسامان تھے (پ ۴ ر ۴) از مؤلف۔

جائز ہے۔ کیا بندے بھی ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ غیر اللہ کی مدد میں اور اللہ تعالیٰ کی مدد میں کیا فرق ہے؟ **جواب**۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے بندوں میں بھی مدد کرنے کی قدرت رکھی ہے اس لیے وہ بھی مدد کر سکتے ہیں چنانچہ اس آیۃ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ یعنی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو اور گناہ و زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو (پ ۶ ر ۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں میں مدد کرنے کی استعداد ہوا کرتی ہے جب ہی تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اپنی استعداد کو اچھے طریقے پر استعمال کرو۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذاتی قدرت سے مدد فرماتا ہے اور بندے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوت کی بنا پر مدد کر سکتے ہیں ؎

اولیا را ہست قدرت از الٰہ
تیر جستہ باز گردانند ز راہ

انسانی تمام ضروریات دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جسے پورا کرنا غیر اللہ کی طاقت و قدرت سے باہر ہو جیسے اولاد دینا۔ پانی برسانا وغیرہ تو اس میں بندوں سے مدد مانگنا صریحاً حرام ہے۔ دوسری وہ ضروریات انسانی جسے پورا کرنا بندوں سے ممکن ہو مثلاً دشمن سے بچانا۔ یا خدمتگاروں سے رات دن کی حاجتیں طلب کرنا۔ عہدہ داران مجاز سے ملازمت مانگنا وغیرہ ایسی صورت میں جائز ہے جبکہ مانگتے وقت اس غیر خدا کو فاعلِ حقیقی نہ جانے بلکہ جس غیر اللہ سے مدد مانگی جائے اس کو اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظہر سمجھے اور حقیقی کارساز و قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہی کو جانتے ہوئے اسی پر پورا پورا بھروسہ رکھے اور صرف اس لیے غیر اللہ سے مدد طلب کرے کہ اس عالم اسباب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے بندہ کو بظاہر مدد کرنے والا بنایا ہے۔۱؎

پس اس عقیدہ کے ساتھ غیر اللہ سے مدد چاہنا بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی سے مدد چاہنے کے برابر ہوگا۔ لہذا یہ عرفان کے خلاف نہیں کیونکہ حضرات انبیاءؑ و اولیاءؒ سے بھی اسی اصول کے تحت غیر اللہ سے مدد چاہنا ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھی قیدی سے (جو خواب کی تعبیر کے لحاظ سے بادشاہ کا ساقی بننے والا تھا) کہا تھا اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ یعنی اپنے آقا کے پاس میرا بھی تذکرہ کرنا (پ ۱۲ ر ۱۵) کہ ایک بے قصور آدمی قید میں پڑا ہوا

۱؎ اسباب سے کام لینے میں مردِ مومن کی زندگی اس طرح غیروں سے ممتاز ہوتی ہے کہ یہ اپنی ہر تدبیر کے وقت یہ سمجھتا ہے کہ میری تدبیر اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی بھی یہی مرضی ہو۔ اور غیر مومن اپنی تدبیر کرتے وقت یہ سمجھتا ہے کہ میرا کام میری تدبیر کی وجہ سے ہوتا ہے لہذا وہ اپنی تدبیر پر بھروسہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو فاعلِ حقیقی نہیں سمجھتا ۱۲

(از مؤلف)

ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے قید سے رہائی کے لیے اس قیدی سے مدد چاہی تھی علاوہ ازیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس مقصد سے کہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے مدد ملے بارگاہِ رب العزت میں عرض کیا وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ○ یعنی اور میرے بھائی (حضرت) ہارون (علیہ السلام) کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے تو ان کو میرے ساتھ رسالت دے کر میرا مددگار (مدد دینے والا) بنادے کہ میری تصدیق اور تائید کریں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ (فرعونی) لوگ مجھے جھٹلادیں (پ ۲۰ ع ۷) جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ نہیں فرمایا کہ "میری مدد جب موجود ہے تو پھر اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا مددگار کیوں بنانا چاہتے ہو" بلکہ آپ کی یہ درخواست منظور فرمائی جا کر ارشاد ہوتا ہے قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ یعنی فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) کہ ہم ابھی تمھارے بھائی کو تمھارا قوتِ بازو بنائے دیتے ہیں (پ ۲۰ ع ۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ دینے والا ہے اور میں بانٹنے والا ہوں" اور یہ عام اصول ہے کہ تقسیم کرنے والے سے مانگا جاتا ہے اس لیے رسول اللہ سے مانگا جائے تو کیسے غلط ہو سکتا ہے جبکہ مانگنے والا اللہ تعالیٰ ہی کو فی الحقیقت دینے والا سمجھتا ہو۔

سوال ۴۸۔ جب مندرجہ بالا شرائط کے ساتھ غیر اللہ سے مدد مانگنا درست ہے تو کیا مُردوں سے بھی زندوں کی طرح مدد مانگی جا سکتی ہے؟ **جواب** بعض حضرات جو بہت جلد شرک سے متہم فرما دیا کرتے ہیں وہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ زندوں سے مدد مانگی جا سکتی ہے۔ مگر مُردوں سے کسی طرح کی مدد چاہنا اس لیے غلط بتلاتے ہیں کہ وہ مُردہ ہونے کی وجہ کچھ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا پہلے یہ بتایا جاتا ہے کہ موت کسے کہتے ہیں اور جسم کی موت میں اور روح کی موت میں کیا فرق ہے اور ہر روح میں ادراک ہے یا نہیں۔ پھر بتلایا جائے گا کہ جس طرح زندہ آدمی کسی کام کو انجام دیتا ہے اسی طرح مُردہ میں بھی صلاحیت ہوتی ہے یا کیا اگر مردہ زندہ کے اوصاف والا ثابت ہو جائے تو مُردے سے بھی انہی امور میں مدد چاہنا اسی طرح درست ہو جائے گا جس طرح زندہ سے مدد چاہنا درست سمجھا گیا ہے؟ لہٰذا ذیل میں پہلے یہ بتلایا جاتا ہے کہ:-

موت کسے کہتے ہیں

جسم خاکی سے روح کے جدا ہونے کو موت کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں جسم اور روح دونوں کو بھی جو موت لاحق ہوتی ہے وہ اپنے معنی کے لحاظ سے باہم مختلف ہے۔ چنانچہ جسم کی موت تو ایک واضح چیز ہے جس سے سب واقف ہیں کہ روح نکل جانے کے بعد جسم بے حس و حرکت اور

ادراک و شعور سے خالی ہو جاتا ہے اور فنا ہونے لگتا ہے۔ لیکن روح کا ادراک و شعور ویسا ہی رہتا ہے بلکہ جسم کا پردہ درمیان سے ہٹ جانے کی وجہ روح میں اور زیادہ صفائی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ وہ ان تمام تدابیر سے بھی آزاد ہو جاتی ہے جو اُسے جسم میں رہنے کے وقت سفلی امور کے لیے انجام دینے پڑتے تھے۔ اور روح امرِ رب ہونے کی وجہ فنائیت سے محفوظ ہے اس لیے روح کی موت جسم کی طرح نہیں بلکہ ان معنی میں ہے کہ جسم خاکی سے روح جدا ہونے کے بعد[1] اُس ترقی سے رُک[2] جاتی ہے جو جسم میں رہ کر دنیا میں نیک عمل کرنے سے اس کو حاصل ہوتی تھی۔ اور روح کی وہ لذتیں بھی ختم ہونا گویا روح کی موت ہے جو اُسے دُنیا میں جسم کے توسط سے حاصل ہوا کرتی تھیں مثلاً کھانا پینا وغیرہ۔

قبر سے روح کا تعلق

اس طرح ہوتا ہے جیسے عاشق کو اپنے معشوق کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ بدن قائم اور مدفون ہو ورنہ قبر کا عذاب اور قبر کا آرام فقط روح کو ہے۔

الغرض ارواح خواہ شہید کی ہوں یا عام مسلمانوں کی یا فاسق و مشرک کی ادراک و شعور حرکت و احساس وغیرہ سے خالی ہر گز نہیں کہی جاسکتیں اس لیے کہ عذابِ قبر یا قبر میں آرام و آسائش کا صاحبِ قبر کو احساس ہونا احادیث سے ثابت ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ مردہ کو ضرور ادراک ہوتا ہے ورنہ قبر کا عذاب یا اس کا آرام بے معنی قرار پائے گا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ عام مُردوں کی حیات شہیدوں کی حیات سے کم درجہ کی ہے اور انبیاءؑ کی حیات شہیدوں سے

---

[1]۔ چونکہ حسناتِ جاریہ (جیسے نیک لڑکا وغیرہ) مُردے کے لیے باعثِ اجر ہوتے ہیں اس لیے یہاں "رُوح جُدا ہونے کے بعد" کا فقرہ اضافہ کر کے یہ بتلایا گیا ہے کہ حسناتِ جاریہ تو مرنے سے پہلے کے کئے ہوئے ہوتے ہیں یا وارث وغیرہ ایصالِ ثواب کریں تو بھی وہ اپنی زندگی کے زمانے میں ہی کرتے ہیں مگر ایسا کوئی عمل نہیں ہے جسے کوئی شخص خود کے لیے یا غیر کے لیے اپنے مرنے کے بعد آخرت میں بدلہ پانے کے لیے کر سکے۔ ۱۲

[2]۔ لیکن شہیدوں کی روحوں کو روح کی موت بھی لاحق نہیں ہوتی کیونکہ ان کے عملِ شہادت کا ثواب ترقی کرتا اور چند در چند ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جو آدمی مرتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے لیکن جو راہِ خدا میں جہاد کر کے شہید ہوتا ہے وہ گویا جہاد ہی میں رہتا ہے اور اس کا عمل قیامت تک جاری رہتا ہے۔" اور ان کی روحیں اس جسمِ خاکی سے نکل کر دوسرے جسم یعنی سبز پرندوں کی شکل میں جا کر جسمانی لذتوں سے بھی لطف اُٹھاتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ شہیدوں کو مُردہ نہ خیال کرو وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس رزق دئے جاتے ہیں (پ ۲ ر ۳) جس سے ثابت ہوا کہ شہیدوں کی رُوح زندہ ہے۔ (از مؤلف)

زیادہ کامل قسم کی ہے۔ اگرچہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ یعنی ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے (پ ۴ ع ۱) کے لحاظ سے پیغمبر بھی موت کا مزہ چکھائے جاتے ہیں۔ لیکن پھر سرتاپا حیات ہو جاتے ہیں چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ روایت ہے کہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِہِمْ یُصَلُّوْنَ۔ یعنی کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ انبیاء زندہ ہیں اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں دوسری حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جو مسلمان[1] مجھ پر سلام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح کو لوٹاتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں" (مدارج النبوۃ)

اب اس امر کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے کہ دیگر مُردے بھی زندوں کی طرح سُنتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ کھاتے ہیں۔ پیتے ہیں اور نقل و حرکت بھی کرتے ہیں حتیٰ کہ ان مرنے والوں سے زندوں کی مدد بھی واقع ہوئی ہے۔ لیکن جسم خاکی میں نہ رہ کر جب روح کام کرتی ہے تو ظاہر بین نگاہوں کو چونکہ نظر نہیں آتا اس لیے اس سے انکار کر دیا جاتا ہے لیکن بہ نظرِ غائر اگر دیکھا جائے تو دنیا میں ہو خواہ مرنے کے بعد ہر کام کرنے والی درحقیقت روح ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسی کئی مثالیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے بھی جسم خاکی کے بغیر روح نے ہی کام کیا ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بحالت خطبہ سیکڑوں میل پر جہاد کرنے والے اسلامی لشکر کو طریقۂ جنگ سے آگاہ کیا تو روحانیت ہی کی وجہ سے کیا ورنہ ان کا جسم تو منبر ہی پر تھا۔

پس معلوم ہوا کہ مردے اور زندے میں کام کرنے والی چیز دراصل روح ہی ہے نہ کہ جسم اور جب جسم خاکی سے روح نکل کر آزاد ہو جاتی ہے تو پھر کس طرح روح کو مجبور کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز قفس (پنجرہ) میں مجبور رہتی ہے مگر ایسے حضرات سے کیا کہا جائے جو روح کو اس کے پنجرے یعنی جسم خاکی میں تو مدد کرنے کے قابل مانتے ہیں لیکن جب وہ پنجرے سے آزاد ہوتی ہے تو اُسے اور قوی ماننے کے بجائے مجبور کہتے ہیں۔

ذیل میں قرآن و حدیث سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ مردوں میں بھی زندوں کے وہ اوصاف پائے جاتے ہیں جن کے سبب سے زندوں سے مدد مانگنا درست سمجھا جاتا ہے۔ (باقی)

---

[1] جو مصاحبین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھنے سے روکنے کو کارِ خیر سمجھتے ہیں وہ اس حدیث کے الفاظ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰہُ رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیْہِ السَّلَامَ پر غور فرمائیں تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انتقال کے بعد بھی مسلمان کے سلام کہنے کو نہ صرف جائز بلکہ اپنی طرف سے اس کے سلام کے جواب دینے کو ثابت فرمایا ہے۔ جب آپ انتقال کے بعد بھی ہر ایک کے سلام کا جواب دیتے ہیں تو پھر سلام پڑھنا کیسے غلط ہو سکتا ہے۔ ۱۲ (از مؤلف)

مردے زندوں کی آواز سنتے اور سمجھتے ہیں

چنانچہ مُردوں سے اسی طرح مخاطبت کی گئی ہے جسطرح زندوں سے کیجاتی ہے اور انسان زندوں کو جسطرح حکم دیتا ہے اسی طرح مُردوں کو بھی دیا ہے اور زندے جسطرح سنکر عمل کرتے ہیں اسی طرح مُردے نے بھی سنکر اس حکم کی تعمیل کی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءً یعنی کہا (اللہ تعالے نے حضرت ابراھیم علیہ السلام سے) کہ تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلالو پھر ہر پہاڑ پر ان میں کا ایک ایک حصہ رکھدو (پ۳ ر۳) اسکے بعد فرماتا ہے کہ اے ابراہیم ع ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ط یعنی پھر ان سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس سب دوڑے دوڑے چلے آئیں گے (پ۳ ر۳) تو وہ ذبح شدہ اور ٹکڑے ٹکڑے کئے ہوئے چاروں پرندے جو یقیناً مردہ تھے اگر سننے والے نہوتے تو پھر اللہ تعالے اپنے پیغمبر حضرت ابراھیم علیہ السلام کو یہ حکم کیسے دیتا کہ ان بے جان پرندوں کو تم بلاؤ۔ پھر یہ کہ آپ کی آواز پر ان پرندوں کا زندہ ہوکر آنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالے مُردے کو سناتا ہے جسطرح زندے کو سننے والا بھی وہی بناتا ہے۔ مسلم شریف کی حدیث ہے کہ جسوقت لوگ مُردے کو دفن کرکے واپس ہوتے ہیں تو مُردہ ان لوگوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔ اور جنگ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کافروں کو ایک پلید و نجس کنوئیں میں ڈلوادیا پھر صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ اس کنوئیں کے پاس آئے جس میں اُن اشد کافروں کے لاشے ڈالے گئے تھے اور انکے نام لے لیکر فرمایا۔ "اے عتبہ۔ اے ابوجہل۔ اے شیبہ! اب جبکہ پردہ اُٹھ گیا ہے تو کیا تم کو اب یہ پسند آتا ہے کہ تم خدا اور اسکے رسول کی فرمانبرداری کرتے اور کیا تم نے اللہ تعالے کے عذاب کو دیکھ لیا؟" اور فرمایا کہ "جو وعدہ ہمارے پروردگار نے ہم سے کیا تھا اسکو ہم نے حق پایا (یعنی فتح کا) کیا تم نے بھی اپنے اعمال کے بدلے کو پالیا؟" دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی مُردہ کافروں سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ "تم نے مجھے جھٹلایا اور لوگوں نے میری تصدیق کی"۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! کیا گفتگو کرتے ہیں آپ ایسے جسموں سے جس میں روحیں نہیں ہیں"۔ یہ سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نوٹ اس پر اگر یہ کہا جائے کہ یہ بطور معجزہ تھا اس لئے وقتیہ طور پر مردے کو سنا دیا گیا تھا تو اس لئے غلط ہے کہ اسوقت کوئی غیر مسلم سامنے نہ تھے جن پر یہ معجزہ ظاہر کروایا گیا ہو بلکہ اللہ تعالے اس وقت اپنے پیغمبر کو اس بات سے مطمئن فرمارہا تھا کہ دیکھو مُردے اس طرح زندہ کئے جاتے ہیں لہٰذا اس سے ہر مُردہ کا سننا ثابت ہوتا ہے جبکہ بے جان ہونے میں حیوان و انسان سب برابر ہیں۔ (از مؤلف)

نے فرمایا کہ "قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ مُردے تم سے زیادہ سنتے ہیں اور جو میں کہتا ہوں یہ سنتے ہیں لیکن جواب نہیں دے سکتے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ مُردے نہ صرف سنتے ہیں بلکہ سمجھتے بھی ہیں اور اس گفتگو سے بھی واقف ہوتے ہیں جو ان سے کیجاتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان میں جاتے تو مُردوں سے مخاطب ہو کر فرماتے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْقُبُوْرِ وَ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ اَنْتُمْ لَنَا سَلَفٌ وَ نَحْنُ بِالْاَثَرِ یعنی قبر والو تم پر سلام ہو بخشے اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو تم ہم سے پہلے ہیں اور ہم پیچھے۔ اگر اہلِ قبور نہ سنتے نہ سمجھتے تو پھر آپ کا انکو یہ خطاب فرمانا ایک عبث کام قرار پاتا ہے جو یقیناً عبث نہیں ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ خواہ کہ مؤمن شہید ہو کہ غیر شہید سب میں شعور و تمیز ہوا کرتی ہے حتیٰ کہ پاک نفوس میں کبھی انکی روح کا اثر انکے جسم خاکی تک جب پہنچتا ہے تو نہ انکا جسم سڑتا ہے نہ گلتا ہے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور شہداء و اولیائے کرام کا حال ہے۔

مردہ کہتا بھی ہے

جس کا ثبوت اس آیت قرآنی سے بھی ملتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس نیک شخص کا حال بیان فرمایا ہے جسے لوگوں نے اسلئے قتل کر دیا تھا کہ وہ نبیوں کی آمد پر لوگوں کو ان پر ایمان لانے کی ہدایت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ جب وہ شہید ہوئے تو قِیْلَ ادْخُلِ

لہ ایسے موقعوں پر یہ آیۃ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ○ یعنی آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہیں جس وقت وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں (پ۲۰ ر۲) پیش کر کے مُردوں کو نہ سننے والا ثابت کرنیکی کوشش کیجاتی ہے۔ حالانکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ مُردے نہیں سنتے۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اے پیغمبر! آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے جیسے کہ اسکے بعد فرمایا ہے کہ آپ بہروں کو نہیں سنا سکتے اور دوسری آیۃ وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ○ یعنی اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں (مدفون) ہیں (پ۲۲ ر۱۵) سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود اس پر قادر نہیں ہیں کہ مُردے کو سنائیں یا بہرے کو سنائیں بلکہ اللہ تعالیٰ اسپر قادر ہے کہ جسے سنانا چاہے اسکو آپ کی آواز کا ادراک ہو جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَھُمْ مُّسْلِمُوْنَ○ یعنی مگر آپ اس شخص کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں اور پھر وہ مانتے (بھی) ہیں (پ۲۰ ر۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب کو نصیحت فرماتے مگر اسے سمع قبول کے ساتھ وہی سُن سکتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق دیکر اس قابل بنانا چاہتا۔ اسی طرح وہی مُردے یا قبر والے زندوں کی آواز سن سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سنانا چاہتا ہے۔ کیونکہ زندہ ہو کہ مُردہ سب کو سننے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ ہی عطا فرماتا ہے۔ لہذا بیان کردہ دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے پھر یہ کہنا کہ زندہ بہر حال سنتا ہے مگر مُردہ کسی حال نہیں سن سکتا کہاں تک حق بجانب ہو سکتا ہے۔ ۱۲ (از مؤلف)۔

الْجَنَّةَ ؕ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ ۝ ارشاد ہوا کہ جا جنت میں داخل ہو۔ کہنے لگا کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے مجھ کو بخش دیا اور مجھکو عزت داروں میں شامل کر دیا (پ۲۳ ر۱) پس اس سے معلوم ہوا کہ شہید ہونے کے بعد ایسے وقت انہوں نے بطور آرزو یہ کہا ہے جبکہ انکی قوم دنیا میں موجود تھی۔ کیونکہ یَعْلَمُوْنَ یعنی جانتے یا جانیں گے کا لفظ حال و مستقبل کے مفہوم کو ادا کرتا ہے اس مطلب کو ثابت کرتا ہے کہ یہ انکا کہنا قیامت سے پہلے مرنے کے بعد واقع ہوا ہے۔ اب اس کے بعد بھی کسی کا یہ سمجھنا کہ مُردہ نہیں کہتا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔

مُردہ دیکھتا بھی ہے

چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اسوقت تک اپنے حجرہ شریف میں سادگی سے چلی جایا کرتیں جبتک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی دفن تھے۔ اور یہ فرماتیں کہ "یہ میرے شوہر ہیں اور یہ میرے والد"۔ لیکن جب اس حجرۂ شریف میں حضرت عمرؓ دفن ہوئے تو اچھی طرح کپڑا اوڑھ کر جایا کرتیں اور فرماتیں کہ "عمرؓ سے مجھے شرم آتی ہے"۔ اور جبکہ حضرت امام شافعیؒ نے امام اعظم ابو حنیفہؒ کی قبر کے پاس فجر کی نماز ادا کی تو نہ آمین زور سے کہا نہ دعائے قنوت پڑھی۔ نماز کے بعد جب لوگوں نے پوچھا کہ "آپ نے اپنے مسلک کے خلاف کیوں کیا"۔ تو حضرت امام شافعیؒ نے جواب دیا کہ "مجھے اس قبر والے (امام ابو حنیفہؒ) سے شرم آتی کہ ان کے پاس انکے مسلک کے خلاف کروں"۔ اگر مُردہ دیکھنے والا نہ ہوتا اور سننے والا نہ ہوتا تو یہ دونوں بزرگ اپنے عمل میں تبدیلی نہ کرتے۔

مردہ کھاتا بھی ہے

جب ہی تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ یعنی جو لوگ اللہ تعالےٰ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مُردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے پاس رزق دئے جاتے ہیں۔ وہ خوش ہیں اس چیز سے جو انکو اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے (پ۴ ر۸) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی زندگی ختم ہونے کے بعد بھی وہ کھاتے ہیں اور انکا خوش ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ادراک و شعور بھی رکھتے ہیں۔ ورنہ نہ کھانے والوں کو رزق دیا جانا اور ادراک و شعور نہ رکھنے والوں کا خوش ہونا بے معنی قرار پاتا ہے اب رہی یہ بات کہ مُردے کس طرح کھاتے پیتے ہیں تو اسکا علم اللہ تعالےٰ ہی کو ہے ہمکو انکا کھانا پینا اسی طرح نظر نہیں آتا جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیاوی زندگی میں وہ کھانا پینا نظر

نہیں آتا تھا جس کا ذکر حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال (یعنی ناغہ کئے بغیر روزانہ روزہ رکھنے سے منع فرما کر اپنے مسلسل روزے رہنے سے متعلق فرمایا تھا کہ "میں تمہاری جیسی حالت نہیں رکھتا بلکہ میں میرے اللہ کے پاس رہتا ہوں مجھے وہ کھلاتا ہے وہ پلاتا ہے۔" پس مندرجہ بالا دلائل کے بعد مُردے کے کھانے پینے کے بارے میں انکار اس بنا پر درست نہیں کہ انکا کھانا پینا ہم کو نظر نہیں آتا۔

مُردہ نقل و حرکت کرتا ہے

مُردے کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اور نقل و حرکت کرنا بھی اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان چار پرندوں کو (جنکا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے) ٹکڑے ٹکڑے کیا اور اس میں سے تھوڑا تھوڑا چند پہاڑوں پر رکھ کر پھر درمیان میں کھڑے ہوکر انہیں جب بلایا تو ان پرندوں کے وہ متفرق ریزے جو ابھی زندہ نہیں ہوئے تھے اپنی اپنی جگہ سے مردہ حالت میں حرکت کرکے پہلی ترکیب کے موافق آ آ کے ایکدوسرے سے ملکر الگ الگ جسم بن گئے اور وہی چار پرندے زندہ ہوکر آپ کے پاس جمع ہوگئے۔ اگر مردہ حرکت کرنے والا نہ ہوتا تو پھر ان پرندوں کے بے جان اجزا آ آ کر کس طرح آپس میں ملے تھے۔ اگر یہاں یہ اعتراض پیدا کرنے کی کوشش کیجائے کہ پرندوں کی مثال سے مردہ انسانوں کی نقل و حرکت کیسے ثابت کیجا سکتی ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس سے انسانوں کے مرکر زندہ ہونے کو چونکہ ثابت فرمایا ہے اسلئے اسکا اطلاق انسانوں کے متعلق ضرور ہوسکتا ہے

مردے نے زندوں کی مدد بھی کی ہے

چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں پچاس وقت کی نمازوں کا تحفہ لیکر واپس ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے امت محمدیہ کی مدد کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پچاس وقت کی نمازوں میں کمی کروانے کے لئے جس طرح آمادہ کیا اسکی تفصیل ذیل کے اشعار سے معلوم ہوسکتی ہے جسے حضرت والد ماجد فاضل مدظلہ نے نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان فرمایا ہے ؎

لے کے یہ تحفہ نبی چرخِ ششم پر آئے
پوچھا موسیٰؑ نے کیا فرض ہوا آج کی رات
کہا پنجگانہ نمازیں، تو کہا موسیٰؑ نے
سعی تخفیف ذرا کیجئے گا آج کی رات
نہ ادا کر سکی امت مری دو وقت نماز
کیا کروں آپ سے امت کا گلا آج کی رات
آپ کی امتِ مرحومہ تو ہے اور ضعیف
اتنا بار اس پہ ہوا ہے غور کی جا آج کی رات
سُن کے موسیٰؑ سے یہ واپس ہوئے سردارِ امم
شرم و آداب سے یوں عرض کیا آج کی رات
ناتواں ہے مری امت، ہو مرے رب تخفیف
خود تو ہو واقف ہے کہوں اور میں کیا آج کی رات

حق نے فرمایا کہ لو، پانچ کی کرتے ہیں کمی
شاہؐ نے آکے یہ موسیٰؑ سے کہا آج کی رات

بولے موسیٰؑ، کرو کوشش کہ ہو تخفیف مزید
نہ ملے گا کبھی موقع جو ملا آج کی رات

شاہ آتے گئے، جاتے گئے، کرتے گئے عرض
آمد و رفت کا اک شوق رہا آج کی رات

آخر الامر رہیں پانچ نمازیں قائم
رحمتِ خاص سے یہ حکم ہوا آج کی رات

جو پڑھے پانچ وہ پائے گا ثواب پنجاہ[لہ]
تری خاطر سے یہ فرمان ہوا آج کی رات

اگر اس طرح حضرتِ موسیٰ علیہ السلام انتقال کر چکنے کے باوجود امتِ محمدیہ کے زندہ افراد کی مدد فرماتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار کمی کرانے متوجہ نہ کرتے تو ہم سے کس طرح پچاس وقت کی نمازیں روزانہ ادا ہو سکتی تھیں جبکہ موجودہ پانچ وقت کی نمازوں کا ادا کرنا ہم پر بہت گراں ہوا کرتا ہے۔

اور جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے امت محمدیہ کے کسی فرد کی درخواست کے بغیر از خود یہ مدد فرمائی اور ایک بڑی مشقت سے سب کو محفوظ رکھا اسی طرح پاک ارواح سے بجا طور پر یہ امید کر کے مدد مانگی جا سکتی ہے کہ وہ ضرور ہمارے واسطے اسی طرح مدد کیلئے آمادہ ہیں جیسا کہ اپنی دنیوی زندگی میں رضائے الٰہی کی خاطر ہر انسان کو فائدہ پہنچانے کیلئے تیار رہتے تھے۔ مگر ہم کو اسکا احساس اسلئے نہیں ہوتا کہ زندوں کی طرح مردوں سے ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ ہماری مدد کس طرح کر رہے ہیں اسی واسطے مردوں کی مدد کے آثار بالکل تائید الٰہی کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اور اسے کوئی شخص اللہ تعالےٰ کی مدد کے مظاہر سے اسلئے امتیاز نہیں کر سکتا کہ ہر ایک بندے کی مدد کا اثر اللہ تعالےٰ ہی کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے اور جبتک اسکی مرضی نہ ہو نہ زندہ میں یہ قدرت موجود ہے کہ کسی کی مدد کر سکے نہ مردے میں بلکہ ہر ایک کو مدد کرنے کے قابل بنانا اور کسی کے حق میں اسکو مفید کرنا اسی قادرِ مطلق کا ہی کام ہے۔

شبہہ:- یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب سب کام اللہ تعالےٰ ہی کی طرف سے ہوتے ہیں تو پھر بندوں (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) سے مدد کیوں حاصل کیجائے

جواب:- اسلئے مدد حاصل کیجائے کہ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے جس کے لئے مسبب الاسباب نے دیگر اسباب کے منجملہ ایکدوسرے کی مدد کو بھی کئی کاموں کی تکمیل کا سبب بنایا ہے اور جس طرح اللہ تعالےٰ قیامت میں سبکو بخشنے والا ہونے کے باوجود کئی گنہگاروں کو مقبول بندوں کی شفاعت کی وجہ سے بھی بخشے گا اسی طرح وہ اس بندے کی بھی حاجت پوری فرماتا ہے جس کے لئے کوئی مقبول بندہ (زندہ ہو یا مردہ) مدد کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ ان بندوں پر ضرور توجہ فرماتا ہے جو اسکے

لہ پچاس وقت کی نمازوں کو کم کروانا اسلئے زندوں کی مدد ہے کہ نماز زندوں کیلئے ہی فرض ہے نہ کہ مردوں کیلئے ۱۲ (از مؤلف)۔

مقبول بندوں سے مدد چاہتے۔ جیسا کہ ارشاد باری
تعالےٰ ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ
فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا
اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○ اور اگر وہ لوگ جس وقت انہوں
نے اپنا برا کیا تھا آتے آپ کے پاس پھر اللہ تعالےٰ
سے معافی چاہتے اور رسول بھی انکو بخشواتے البتہ
اللہ تعالےٰ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان
(پ۵ ر۶) مطلب یہ کہ وہ گنہگار جو خود اللہ تعالےٰ
سے اپنے لئے مغفرت طلب کرنے کے علاوہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مغفرت کیلئے مدد لیتے
ہوئے حاضر خدمت ہوکر آپ سے اپنی بخشش کیلئے
دعا کرواتے ہیں انکو اللہ تعالےٰ بخشتا ہے۔ جب
گناہوں کی بخشش جیسے معاملے میں آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کا درمیان میں آنا جو ایک طرح کی مدد ہی
ہے اللہ تعالےٰ کے بخشنے کیلئے شرط قرار دیا گیا ہے تو
پھر دیگر امور میں رسول یا انکے جانشین مقبول خدا
بزرگوں سے مدد چاہنا کیسے غلط ہو سکتا ہے جبکہ مدد
چاہنے والا اپنی مدد کرنے والے بندے کو بذات خود
حاجت پوری کرنے والا ہرگز نہیں سمجھتا بلکہ کسی بھی
بندے سے یہ سمجھتے ہوئے مدد لیتا ہے کہ شاید اللہ تعالےٰ
اس کی وجہ سے رحم کرکے حاجت کو پوری فرمادے۔

سوال ۸۵۔ جبکہ مندرجہ بالا آیات و احادیث
سے شہیدوں اور پیغمبروں کیلئے حیات ثابت ہے
تو یہ مانا جا سکتا ہے کہ صرف انہی سے مدد مانگنا درست
ہو لیکن یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ان کے جانشین
مقبول خدا بزرگوں سے بھی اسی وجہ سے مدد مانگی
جا سکتی ہے؟ **جواب**۔ نیک علما کا جانشین رسول
ہونا ثابت ہے اسلئے ان میں رسول کا اثر پایا جانا
ضروری ہے لہذا جو کام رسول کرتے ہیں وہ نیکوں
سے بھی کسی حد تک ہو سکتے ہیں چنانچہ میدان قیامت
میں پیغمبروں کی طرح نیک بندوں کو بھی اللہ تعالےٰ
شفاعت کرنے کی اجازت دیگا اور انکی شفاعت
کو یقیناً قبول فرمائیگا۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالےٰ
نے خدا و رسول کے فرمانبرداروں کو انبیا و شہداء
وغیرہ کا ساتھی فرمایا ہے ارشاد ہے وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ
وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ
وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ○ یعنی اور
جو شخص اللہ و رسول کا کہنا مان لیگا تو ایسے اشخاص
بھی ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ تعالےٰ
نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیا اور صدیقین اور
شہدا اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق
ہیں (پ۵ ر۶) تو پھر اسکے بعد یہ کہنا کہاں تک درست
ہو سکتا ہے کہ نیک بندے انبیاء و شہداء کی طرح
نہیں ہیں۔ اور انکی طرح وہ مدد نہیں کر سکتے۔ رہا
یہ کہ کسی کا نیک ہونا نہ ہونا اگرچہ صرف اللہ تعالےٰ
کو معلوم ہے لیکن ہمارے لئے تو یہ ضرور ہے کہ
بظاہر جو نیک معلوم ہو اس سے ہرگز بدگمانی نہ
کریں جیسا کہ حضرت سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎
ہر کرا جامہ پارسا بینی   پارسا دان و نیک مرد انگار

ورنہ دانی کہ درنہانش چیست   محتسب را درونِ خانہ چہ کار

لہٰذا علم و تقویٰ سے جو مزین ہوں انکو نیک سمجھنا گناہ نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو سب انسانوں میں اسی طرح چھپا دیا ہے جس طرح تمام راتوں میں شبِ قدر کو تاکہ ہر شخص سب کو نیک سمجھے اور کسی سے بدگمانی نہ کرے چہ جائیکہ ایسوں کو برا سمجھنا جنکو مسلمانوں کی بڑی تعداد نیک مانے اور انکے بارے میں یہ کہنا کہ یہ مرنے کے بعد کچھ بھی مدد نہیں کرسکتے حقیقت سے انکار کے مترادف ہے۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مُردوں میں بھی وہ تمام صفات رکھی ہیں جو زندوں میں کسی کام کے انجام دینے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں اور جس اصول کے تحت زندوں سے مدد مانگنا درست سمجھا جاتا ہے اسی اصول کے تحت یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو فاعل حقیقی سمجھتے ہوئے مردوں سے بھی مدد مانگنا غلط نہیں ہے۔ اور مردے بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت اسی طرح مدد کرسکتے ہیں جس طرح زندے کرسکتے ہیں اور جب کوئی شخص کسی مردے سے اسلئے عقیدت رکھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دوست ہے اور اس سے اسلئے مدد مانگے کہ وہ اہل اللہ میں سے ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے توڑانے والا اسلئے نہیں ہوسکتا کہ اس سے محبت محض اللہ والا ہونے کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کیلئے کسی سے محبت کرنا باعثِ نجات ہے۔ پس اہل اللہ کو عدو اللہ پر قیاس کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔ اور جبکہ زندوں سے مدد مانگنے والے کو زندوں کی پوجا کرنے والا نہیں کہا جاتا تو پھر مُردوں سے اہل اللہ سمجھتے ہوئے مدد مانگنے والے کو مزاروں کی پوجا کرنے والا کہنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً۔ اور یہ کہنا کہ صاحب قبر اگر ولی ہوں بھی تو وہ سننے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ سے ہرگز سفارش نہیں کرسکتے بلا دلیل بات ہے کیونکہ جب قیامت جیسے ہولناک دن میں اللہ تعالیٰ سے اس کے ولی سفارش کرسکیں گے تو پھر ایسوں کا قیامت سے پہلے سفارش نہ کرسکنا کیسے باور کیا جاسکتا ہے

استعانت (مدد طلب کرنے) سے متعلق

اس طویل بحث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہمیشہ صرف اہل اللہ ہی سے مدد مانگی جائے بلکہ بتلانا یہ ہے کہ جس طرح زندوں سے مدد طلب کرنے کو جائز کہا جاتا ہے اسی طرح شرائط بالا کے ساتھ اگر انتقال کئے ہوئے اہل اللہ سے بھی مدد طلب کی جائے تو غلط نہیں ہے۔

مخفی نہ رہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو فاعل حقیقی سمجھتے ہوئے اسی پر پورا بھروسہ

لہ بلکہ جن امور میں زندوں سے مدد مانگنے کو درست قرار دیا جاتا ہے اس میں دشمن خدا زندوں سے مدد مانگنے (جیسا کہ عام دستور ہے) سے تو بہتر یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں (خواہ وہ مرگئے ہوں) ہی سے مدد مانگی جائے۔

رکھتے ہیں وہ ہر کام میں حتی المقدور نہ زندہ بندوں سے مدد مانگنا پسند کرتے ہیں نہ مردوں سے بلکہ ہر سوال صرف اللہ تعالیٰ ہی سے کرتے ہیں حتیٰ کہ توکل کے اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچکر بندہ اپنے کو پوری طرح اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ اللہ تعالیٰ خود ہماری حالت سے باخبر ہے بے آرزو بن جاتا ہے ؎

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دلِ بے مدعا دیا تو نے

چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سولہ سال کی عمر میں آگ کے اندر ڈالا جانے لگا تو اس وقت آپ کے پاس فرشتے نے آکر اپنی طرف سے کہا کہ "آپ فرمائیں تو میں اس ابھی آگ کو بجھا دیتا ہوں"۔ یہ سنکر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ "میرے آگ میں ڈالے جانے سے اللہ تعالیٰ جب باخبر ہے تو پھر مجھے سوال کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ وہ چاہے گا تو خود مجھے بچائے گا اور اگر اُسے میرا جلنا ہی منظور ہے تو اس کی مرضیؒ کے خلاف کسی دوسرے سے مدد لینا ہرگز پسند نہیں کرتا"۔

شبہہ:- یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ توکل کے اس اعلیٰ ترین درجہ کے لوگ جب اللہ تعالیٰ سے بھی مدد مانگنا پسند نہیں کرتے تو پھر اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کہنا ان کے لئے کس لحاظ سے موزوں ہو سکتا ہے؟ **جواب**- اس درجہ اعلیٰ کے متوکلین جب اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "اے خدا! ہم تیری مدد کے محتاج ہیں تیرے سوا ہم کسی سے مدد کی توقع نہیں رکھتے اور نہ کسی کی مدد تیری مرضی کے بغیر ہو سکتی ہے تیری رضامندی حاصل کرنے کیلئے ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں"۔ پس اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کہہ کر ہر صحیح مسلک والا اپنے مطلب کو ادا کر سکتا ہے۔

لے توکل کے اس درجہ والے اللہ تعالیٰ کی مرضی پر راضی رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت سفیان ثوریؒ نے حضرت رابعہ عدویہؒ کے سامنے کہا "اَللّٰهُمَّ ارْضَ عَنَّا یعنی الٰہی تو ہم سے راضی ہو"۔ یہ سنکر حضرت رابعہؒ نے فرمایا "اے سفیان! تمہیں شرم نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی تم طلب کرتے ہو اور خود اس سے راضی نہیں ہوتے"۔ اس پر کسی نے پوچھا کہ "حضرت! یہ بتائیے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے کب اور کیونکر راضی ہوتا ہے"۔ آپ نے جواب دیا کہ جب وہ مصیبت سے بھی ویسا ہی خوش ہو جیسا کہ نعمت سے خوش ہوتا ہے"۔

الغرض عبادت واستعانت کا فائدہ بندے کیلئے ہے خدا تعالے کو اسکی کچھ ضرورت نہیں کہ وہ بالکل بے نیاز ہے۔

پس ہر ایک کو چاہئے کہ استعانت (مدد طلب کرنا) ہو یا اور کوئی معاملہ سب میں افراط (زیادتی) اور تفریط (کمی) سے بچے۔ کیونکہ بعض حضرات بزرگوں سے عقیدت میں اس قدر غلو کر جاتے ہیں کہ اُنکی قبروں کو سجدے کرتے ہیں طواف کرتے اور اُنکو ہر طرح کے حقیقی مالک و مختار سمجھتے ہوئے خدا و رسول کو چھوڑ کر اپنے دین کو برباد کر لیتے ہیں اور اس سلسلہ میں خرافات اور حرام چیزوں کو باعث ثواب سمجھتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ انکے ایسے کام اُس بزرگ کیلئے باعث مسرت ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ حق پرست بزرگ انکی ایسی ناروا عقیدت کے اظہار سے یقیناً خوش نہیں ہوتے جو احکام خدا اور رسول کے تحت نہو۔ مثلاً حضرت حسینؑ اس سے ہرگز خوش نہیں ہوتے کہ انکے علموں سے منتیں مرادیں مانگی جائیں یا حضرت پیران پیرؒ ہرگز اس عمل سے خوش نہیں ہوتے کہ انکے جھنڈے کو خود پیران پیرؒ سمجھا جائے اور ایک کپڑے اور ڈنڈے کو اپنی حاجت پوری کرنے والا مانا جائے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے جب حجر اسود جیسے متبرک پتھر سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا تھا کہ "میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ مجھے نفع پہنچا سکتا ہے نہ کچھ نقصان مگر صرف اسلئے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے میرے رسولؐ کو دیکھا ہے کہ وہ تجھے چومتے تھے"۔ تو پھر کسی مسلمان کا ان خود ساختہ چیزوں کو جنھیں بزرگوں سے خود ہی منسوب کر کے حاجت روا سمجھنا جو قطعاً حرام ہے کیا عذاب دائمی کا مستحق نہیں بنائیگا۔ لیکن اسکے یہ معنی بھی نہیں کہ انتہاپسندی سے کام لیتے ہوئے تفریط (کمی) پر اتر آئیں اور صلحائے عظام و اولیائے کرام حتیٰ کہ انبیا علیہم السلام کی شان میں تک بے ادبی کو جزو دین سمجھ کر گستاخانہ گفتگو شروع کر دیں اور اُن آیات کو جو کافروں اور بتوں کے متعلق ہیں بزرگوں پر منطبق کرنے کی نامحمود کوشش کرتے رہیں اور بزرگوں سے مدد مانگنے کا یہ مطلب سمجھ جائیں کہ اس سے نعوذ باللہ کسی غیر خدا کو خدا سمجھا جا رہا ہے کیونکہ بزرگوں سے مدد چاہنے کی تردید میں ایسی آیات پیش کیجاتی ہیں جن میں خدا تعالے کے مختار کل ہونے کا بیان اور اسکے فاعل حقیقی ہونے کا ثبوت ہے جبکہ اس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں۔ پس نہ افراط اچھی کہ قبر پرستی علم پرستی وغیرہ شروع کر دیجائے نہ کسی کا تفریط پسندی سے یہ کہنا درست ہے کہ اللہ تعالے کسی مُردے کو نہیں سنا سکتا بلکہ صرف سننے کے قابل زندے ہی ہوتے ہیں۔ پس ہر وہ قول و فعل جو افراط (زیادتی) اور تفریط (کمی) کیطرف مائل ہو ٹھیک نہیں۔ درمیانی اور سیدھا ہوتا ہے جس پر چلنے کی دعا کرنے کی تعلیم اللہ تعالےٰ نے اس طرح دی ہے کہ اے میرے بندو تم کہو۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ

اِهۡدِ - بتلا - دکھا - نَا - ہم کو - اِهۡدِنَا کے معنی بتلا ہم کو
صِرَاط - راستہ - مُسۡتَقِيۡم برابر - سیدھا -
صِرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ یعنی راستہ سیدھا - اور اِهۡدِنَا
الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ کے معنی ہوئے بتلا ہم کو
راستہ سیدھا -

ہدایت کے معنی | راستہ دکھانا - توفیق دینا
مطلب کھولنا - مقصود کا
راستہ دکھانا چنانچہ تحفہ کو بھی ہدیہ اسی لیئے
کہتے ہیں کہ ہدیہ اسکے دینے والے کی محبت کو بتلاتا
ہے - اور چونکہ ہدایت کے معنی لطف و مہربانی کے
ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں اسلیئے اس لفظ کا استعمال
ہمیشہ خیر و نیکی ہی میں ہوا کرتا ہے - یا دل میں کسی کام
کا الہام کرنا چنانچہ اللہ تعالےٰ کی ہدایت کے بیشمار
اقسام ہیں منجملہ انکے چند کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے -

ہدایت کے اقسام | (۱) ہدایت الہامی
اس ہدایت کو کہتے ہیں
جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے القا کیجاتی ہے - جیسے
نومولود کا کسی سے سیکھے بغیر اپنی ماں کا دودھ چوسنا
اور اپنی شکایت کو رونے کے ذریعہ ظاہر کرنا وغیرہ
اور عالم میں کوئی چیز اس ہدایت الہامی سے محروم
نہیں ہے چنانچہ قرآن مجید میں اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ
خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ط ۝ یعنی ہر چیز کو اسکے
مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر رہنمائی فرمائی
(پ ۱۶ ر ۱۱) میں اسی طرف اشارہ ہے اور ہدایت
کی اس قسم کا ہر شئی میں پایا جانا وجود باری تعالےٰ
کے دلائل میں سے ایک دلیل بھی ہے (۲) ہدایت
احساسی یعنی وہ ہدایت جو احساسات کے ذریعہ
حاصل ہوتی ہے جس کیلیئے اللہ تعالےٰ نے حواس
ظاہری (سننے - دیکھنے - چھونے - چکھنے - سونگھنے
کے آلات) دیئے اور حواس باطنی (یعنی حس مشترک
خیال - وہم - حافظہ - قوت متصرفہ) عطا فرمائے
ہیں تاکہ اس سے ہر حیوان اپنے لیئے مفید و مضر
اشیا کو تمیز کر سکے - اگر اس قسم کی ہدایت نہ دیجاتی
تو کسی حیوان کی زندگی قائم نہ رہتی -

(۳) ہدایت بداہت عقلی - اس ہدایت کو
کہتے ہیں جسکی وجہ سے ہر طرح کی عقل خواہ وہ اعلیٰ
ہو یا ادنیٰ بغیر کسی استدلال کے صرف اپنے ظاہری
باطنی ذرائع سے نتیجہ نکال کر اس حقیقت حال کو
معلوم کر لیتی ہے جو حواس سے غائب ہوتی ہے
مثلاً جب کسی واقعہ کی خبر مختلف لوگوں سے پہنچتی
ہے تو عقلمند ہو یا احمق ہر ایک اپنے نزدیک اس
خبر کے متعلق سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی ایک حکم
لگا لیتا ہے - اور ہدایت کی اس قسم سے انسان
حتی کہ جن اور فرشتے بھی فیضیاب ہیں - اور

(۴) ہدایت استدلالی عقلی - وہ ہدایت ہے
جس کے ذریعہ عقلی دلائل کو مرتب کر کے اس نامعلوم
کو معلوم کرنے کا طریقہ سمجھ میں آتا ہے جسے ہدایت
عقلی معلوم نہیں کر سکتی ہے - مثلاً ابتدا میں ی

معلوم نہیں ہے کہ یہ عالم قدیم ہے یا نو پیدا ہے جس کیلئے ہدایت استدلال عقلی اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس نامعلوم امر کو معلوم کرنے کیلئے دلائل قائم کئے جائیں چنانچہ پہلے ہدایت عقلی کی ہدایت کے سبب سے یہ معلوم ہوا کہ اس عالم میں رد و بدل اور تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں جس پر عقلی دلیل یہ قائم ہوئی کہ جس میں تغیرات ہوتے رہیں اس کا نو پیدا (حادث) ہونا ضروری ہے لہٰذا استدلال عقلی کی ہدایت نے اس نتیجہ کو یقینی کر دیا کہ جب یہ عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے تو ثابت ہوا کہ یہ عالم حادث (نو پیدا) ہے۔ مگر اس قسم کی ہدایت سے صرف عقلمند اور فلسفی ہی فیضیاب ہوا کرتے ہیں۔

لیکن جب عقل سے قوت وہمیہ مقابلہ کرتی ہے تو عقل کو سیدھے راستہ سے بھٹکا کر غلط نتائج نکالنے کا باعث ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ایک عقلمند کچھ کہتا ہے تو دوسرا عقلمند اس کے برعکس کہتا ہے۔ حتی کہ ایک ہی شخص پہلے ایک بات دریافت کر کے اس پر یقین کرتا ہے تو دوسرے وقت وہی شخص اپنے پہلے مسلمہ کی خود تردید کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کی غلطیوں سے بچنے کیلئے فن منطق مدون کیا گیا ہے مگر وہ بھی ان پریشانیوں کو دور نہیں کر سکا۔ اس واسطے اس کے ازالہ کے لئے اللہ تعالےٰ نے ہدایت کی پانچویں قسم قائم فرمائی۔

(۵) ہدایت بذریعہ انبیا۔ کہ جہاں عقلیں عاجز آجائیں وہاں خدا تعالےٰ الہام انبیا کے ذریعہ سے رہنمائی کرتا ہے۔ غرض جس طرح عوام کو عقلمندوں کے اقوال پر اعتماد ہوتا ہے اسی طرح عقلمندوں کو انبیا علیہم السلام کی پیروی ضروری ہے پس اس سے ضرورت نبوت بھی بخوبی معلوم ہو گئی جس کی طرف اللہ تعالےٰ نے اس آیت وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا یعنی اور ہم نے انکو پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے (مخلوق کو ہدایت) کرتے تھے (پ۱۷ ر۵) میں اشارہ فرمایا ہے۔

(۶) ہدایت انکشافی۔ یہ ہدایت کا بلند ترین مقام ہے جس سے اللہ تعالےٰ بندے کے دل سے ظلماتی پردے اٹھا کر اُسے عالم غیب کے مشاہدے سے فیضیاب فرماتا ہے جس کی وجہ ہر چیز کی اصل حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے اور یہ انبیا علیہم السلام کا حصہ ہے جنکی اطاعت تمام مخلوق پر فرض ہے اور اس ہدایت میں سے کچھ حصہ انکی پیروی کرنے والوں میں سے ان لوگوں کو بھی ملجاتا ہے جنکے دل آئینہ کی طرح انکے انوار قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ایسی صلاحیت والے ولی کہلاتے ہیں پس اس سے نبی اور ولی کا بھی فرق واضح ہو گیا! اور ہدایت کے ان اقسام کے بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دنیا کے تمام کاروبار صنعتیں اور ملکی تدابیر اور احکام آخرت و قواعد شریعت وغیرہ سب کے سب اللہ تعالےٰ ہی کی ہدایات کا نتیجہ ہیں۔

سوال ۸۶ - جبکہ اس سورہ کو تنہا آدمی پڑھتا ہے تو اِهْدِنَا (بتلا ہم کو) کے بجائے اِهْدِنِیْ (بتلا مجھکو) نہ فرمانے میں کیا حکمتیں ہیں؟ **جواب** - اس میں جمع کا صیغہ لانے میں وہی نکتے ہیں جو نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) کے ذیل میں سوال نمبر ۸۱ میں بیان کئے گئے ہیں - اور جب عبادت کے بارے میں نَعْبُدُ (ہم عبادت کرتے ہیں) کہہ کر اور مدد طلب کرنے کیلئے نَسْتَعِیْنُ (ہم مدد طلب کرتے ہیں) کہہ کر سب کی طرف سے بیان کیا گیا تو یہ ضرور ہوا کہ ہدایت کو بھی سب کے واسطے طلب کیا جائے - علاوہ ازیں چونکہ یہ دعائیہ لفظ ہے اور دعا ایسی صورت میں اکثر قبول ہوا کرتی ہے جبکہ زیادہ بندوں کی طرف سے کیجائے اسلئے اِهْدِنَا (بتلا - دکھا) کے ساتھ جمع (نَا یعنی ہم) کو لایا گیا تاکہ یہ دعا ایک فرد کی طرف سے نہ ہو بلکہ جماعت کی طرف سے ہونے کی وجہ قبول ہو جائے اور اس میں اسطرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ بندے نفسی نفسی نہ کریں بلکہ مخلوق کی خیرخواہی کے مدنظر دوسروں کی بھلائی یعنی ہدایت کو دعا میں شریک کر دیں تاکہ جس طرح دعا میں دوسروں کی بھلائی کے خیال سے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اسی طرح ہر معاملہ میں بھی رفاہ عام کا لحاظ رکھیں یہ دعائیہ لفظ ہے اور دعا کرنا در اصل اپنی محتاجی کا ثبوت دینا ہے لہذا جس طرح اللہ تعالے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (سب عالموں کا پالنے والا) ہے اسی طرح اس امر کا ثبوت دینے کیلئے کہ سب اس کے محتاج بھی ہیں اِهْدِنَا (بتلا ہم کو) جمع کا صیغہ بیان ہوا

سوال ۸۷ - سب کے واسطے ہدایت کیوں طلب کی جائے؟ **جواب** - اگر تمام گھر میں سے ایک شخص کو یا پورے محلہ میں سے ایک آدمی کو یا کل شہر میں سے صرف ایک باشندے کو ایک قسم کی ہدایت حاصل ہو اور باقی سب گمراہی میں گرفتار رہیں تو اس ہدایت یافتہ ایک شخص کو بہت دشواری یہ پیش آتی کہ اگر وہ ان ساتھی گمراہوں کی ساتھداری کرے تو جان بوجھ کر اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے والا ہوتا - اور اگر انکے خلاف رہے تو ان سب لوگوں میں یہ مضحکہ بنجاتا اور تمام لوگ اس سے مسخرہ پن کرتے جس کی وجہ اسکا تمام وقت ان سے جنگ وجدل میں گزرتا نتیجہ یہ ہوتا کہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنیکے بجائے رشتہ داری اور قرابت میں برہمی پیدا ہو جاتی - اسلئے ہدایت طلب کرنے کے اس دعائیہ جملہ میں اپنے ساتھ مجبوراً اپنی بنی نوع یعنی سب انسانوں کے واسطے بھی ہدایت طلب کی گئی تاکہ متذکرہ بالا کشمکش سے محفوظ رہ سکیں - اور سب یا اکثر لوگ ہدایت پر ہونے سے کامل فائدہ حاصل ہو سکے

سوال ۸۸ - ہدایت طلب کرنے والے اور دعا کرنے والے جب مومن ہی ہوتے ہیں اور جو مومن ہوتا ہے وہ ہدایت پانے کے بعد ہی ہوتا ہے تو پھر ہدایت پائے ہوئے کا یہ کہنا اِهْدِنَا (یعنی ہماری ہدایت کر) کیسے درست ہوتا ہے؟ **جواب** - اِهْدِنَا کے معنی ثَبِّتْنَا (ہم کو ہدایت پر ثابت قدم رکھو) کے

ہیں اور یہ مسلّم ہے کہ ہدایت یافتہ کا ہدایت پر ثابت
قدم رہنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ
بعض لوگ ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہو جاتے ہیں
اسلئے ہدایت پر ثابت قدم رہنے کی دعا کرنا ہر مومن
اور ہدایت پائے ہوئے کیلئے بہت ضروری ہے
تاکہ ثواب آخرت کا مستحق بن سکے۔ چنانچہ مطیع و
فرمانبردار ہونیکے باوجود حضرت ابراہیم و اسمٰعیل
علیہما السلام نے دعا کی ہے رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا
مُسْلِمَیْنِ لَکَ یعنی اے ہمارے پروردگار ہم کو
اپنا فرمانبردار بنا دے (پ ر ۱۵) اور اللہ تعالے
نے بھی ایمانداروں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے
یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْکِتٰبِ
الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ یعنی اے ایمان والو
اللہ پر اور اسکے رسول پر اور اس کتاب پر جو
اس نے اپنے رسول کی طرف نازل فرمائی اور جو
کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئیں سب پر ایمان لاؤ
(پ۵ ر ۱۷) تو ایمان والوں کو جس طرح اس آیتہ
میں ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح یہاں بھی
ہدایت والوں کو ہدایت کی طلب کا حکم دیا گیا ہے
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات پر ثابت قدمی
اور ہمیشگی مراد ہے تاکہ دمِ آخر تک ہدایت پر قائم
رہنے کی دعا سے خاتمہ ایمان پر ہو سکے کیونکہ ع

آغاز کو کون پوچھتا ہے
انجام اچھا ہو آدمی کا

حکایت

علقمہ نامی ایک صحابی حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں (نعوذ باللہ)
مرتد ہو گئے اور روم کے عیسائیوں میں جا کر رہ گئے
ایک روز حضرت ابوبکرؓ نے انکا حال دریافت کیا
تو کہا گیا کہ وہ مرتد ہو کر روم چلے گئے ہیں۔ یہ سنکر
آپ نے فرمایا وہ تو عقلمند تھے مرتد ہونے کا کیا
سبب ہوا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ علقمہ کہتے ”ہیں بہا
مذہب ہیں کہ خود وہ مذہب والے شک میں ہوں اس
میں رہنا میں پسند نہیں کرتا چنانچہ مسلمان جب دین
حق پر ہیں تو پھر اھدنا (ہدایت کر ہماری) کیوں
کہتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے ہدایت یافتہ
ہونے میں شک کرتے ہیں جب ہی تو اللہ تعالیٰ سے
کہتے ہیں کہ ”ہماری ہدایت کر“۔ یہ سنکر حضرت ابوبکرؓ
نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ انکو خط لکھکر انکے شبہ کو
دور کر دیجئے“۔ جسکی بنا پر حضرت علیؓ نے انکو خط لکھا
”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ حٰمٓ ○
تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ○
غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ
ذِی الطَّوْلِ۔ اسکے بعد لکھا کہ اِھْدِنَا کے معنی
ہمکو ثابت قدم رکھ اور انبیا کے طریقہ پر رہنے کیلئے
ہمارے دلوں کی حفاظت فرماکے ہیں“۔ اس خط کو

ل یعنی شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت
رحم والا ہے۔ حٰم ۰ یہ کتاب اتاری گئی ہے اللہ تعالے کیطرف سے جو
زبردست ہے ہر چیز کا جاننے والا ہے گناہ کا بخشنے والا ہے اور توبہ کا قبول
کرنے والا ہے سخت سزا دینے والا ہے قدرت والا ہے (پ ۲۴ ر ۶)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک آدمی کے ذریعہ علقمہ
کے پاس روم کو بھجوایا۔ جب وہ شخص پہنچا تو علقمہ کو
گرجا میں دیکھا پھر جب سب لوگ گرجا میں سے جا چکے
تو قاصد نے علقمہ کو خط دیا جسے وہ پڑھتے وقت رونے
لگے اور کہتے تھے کہ "ایسے خدا کی نافرمانی کیوں کیجائے
جو اگیبار ڈراتا ہے تو تین بار بخشنے کا وعدہ فرماتا ہے
پھر انھوں نے کلمہ پڑھا اور دوبارہ مسلمان ہو گئے۔

سوال نمبر ۹ ۔ جب مسلمان کو اس دعا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (بتلا ہمکو راستہ سیدھا) کی تعلیم دیگئی اور بتایا گیا کہ نماز میں اللہ تعالےٰ کے سامنے یہ بیان کرے تو ایسی صورت میں ہدایت طلب کرنیکا سوال اسلئے بے موقع ہے کہ نماز پڑھنے والے کو اس حد تک تو ہدایت حاصل ہی ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے سامنے خود کھڑا ہوا ہے۔ پھر اس حالت میں ہدایت طلب کرنا گویا حاصل شدہ چیز کو طلب کرنا ہے جو غلط ہے؟ **جواب** ۔ ہدایت کے اقسام یا اسکے مرتبے جیسا کہ پہلے بیان کئے گئے بہت زیادہ ہیں اسلئے کوئی آدمی بھی ہر وقت ہدایت طلب کرنے سے بے پرواہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جسقدر ہدایت حاصل ہے اس میں اور زیادتی کی اسلئے گنجائش ہے کہ اللہ تعالےٰ کے الطاف وہدایات کی کوئی انتہا نہیں ہے اسلئے کہ جیسا جیسا علم نافع بڑھتا ہے ہدایت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ انسان کا علم دو طریقے سے ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے (۱) اس علم کی ہمیشگی سے یعنی علم کے ساتھ توجہ کے

اوقات مسلسل رہنے اور علم سے بے توجہی کے وقفے زیادہ نہ ہونے سے (۲) دلائل کی زیادتی سے کیونکہ جو علم ایک دلیل سے حاصل ہوتا ہے وہ اس علم کے برابر نہیں ہو سکتا جو کئی دلیلوں سے حاصل ہو۔ مثلاً اس عالم ممکنات کی ہر چیز ذات باری تعالےٰ کے وجود پر ایک مستقل دلیل ہے جیسا کہ شاعر نے کہا؎
وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ   تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ
(یعنی اور ہر چیز میں اللہ تعالےٰ کی نشانی ہے جو اسکے ایک ہونے پر دلالت کرتی ہے) اسلئے کہ ذات باری تعالےٰ کے وجود کے بارے میں علم ہر دلیل سے بڑھتا جاتا ہے۔ جیسے ایک شاعر نے اللہ تعالےٰ کے ایک ہونے سے متعلق اس دلیل کو بیان کیا کہ ؎
ہر گیاہے کہ از زمین روید   وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید
یعنی جو گھانس (پودا) زمین سے اُگتا ہے (وہ ابتدا میں ایک ہی ہوتا ہے تو گویا وہ) اللہ تعالےٰ کے شریک کی نفی کرتا اور (اسکے ایک ہونے کو ظاہر کرتا ہے) اسی طرح علم کے دیگر دلائل کا بھی حال ہے اسلئے انسان کا علم ہر وقت زیادتی کو قبول کرتا ہے اور بہت زیادہ ترقی کر سکتا ہے ؎
در بند آن مباش کہ مضموں نماندہ است
صد سال می توان سخن از زلف یار گفت
چونکہ دلائل ومعلومات کی حد نہیں اسلئے علم کی بھی حد نہیں چنانچہ شیخ الرئیس بوعلی سینا جیسا ماہر اور جامع العلوم اپنے آخر زمانہ میں کہا کرتا تھا کہ "میں نے ابتک صرف یہ جانا کہ کچھ نہیں جانتا"۔

الغرض احکام الٰہی کی تعمیل اور فضائل و مراتب عالیہ حاصل کرنیکا میدان بھی اسی طرح وسیع ہے جس میں سب سے اہم "ثبات" ہے جو ہدایت کے مراتب سے حاصل ہوتا ہے اسی لحاظ سے حضرت علیؓ نے اِهْدِنَا کی تفسیر یہ بتلائی کہ ہمکو ہدایت پر ثابت قدم رکھ، جسکی تائید قرآن مجید کی اس آیۃ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (یعنی اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج (ٹیڑھا) نہ کر بعد اسکے کہ تو ہم کو ہدایت کر چکا ہے (پ ۳ ر ۹) سے ہوتی ہے جسمیں ہدایت کے بعد گمراہی سے بچنے کی دعا بتلائی گئی ہے تاکہ ہدایت پر قیام و ثبات حاصل رہے۔ کیونکہ جب بندے نے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) بحالت نماز کہا تو بارگاہِ قدس سے گویا کہا گیا کہ "کیسے میں مدد کروں" جسکے جواب میں بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا (ہدایت کر ہماری) آئندہ بھی جس طرح ہدایت فرمائی ہے تو نے اب نماز کے وقت اور ہمکو اس ہدایت پر ثابت قدم رکھ۔

سوال نمبر ۹۔ زبان سے کسی مطلب کو چاہنا دو وجہ سے ہی ہوا کرتا ہے (۱) سہو (بھول نے) پر یاد دلانے کیلئے یا (۲) بخیل کو سخاوت پر ابھارنے کیلئے۔ لیکن یہ دونوں سبب اللہ تعالیٰ میں تو نہیں ہو سکتے جو اس سے ہدایت یا ثبات طلب کیجارہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو بھول نہیں جو اِهْدِنَا کہکر اُسے یاد دلایا جائے اور نہ وہ بخیل ہے کہ اس سے ثبات یا ہدایت کا مطالبہ کر کے سخاوت پر اُسے برانگیختہ کیا جانا مقصود ہو۔ تو پھر اللہ تعالیٰ سے درخواست کرنے میں کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ دعا کرنا قضائے الٰہی پر راضی رہنے کے منافی بھی ہے؟

جواب کبھی حکیم مطلق جل وعلا کی حکمت کا تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ طلب کرنے والے کا مطلب بغیر گڑگڑانے اور بے مانگے پورا نہ کیا جائے جیسا کہ ؎

تا نگرید طفل کے جوشد لبن
تا نگرید ابر کے خندد چمن

کیونکہ اس سے بندے میں عاجزی اور انکساری بھی پیدا ہوتی ہے اور تکبر جاتا رہتا ہے پس ہدایت کے مانگنے یا دعا کرنیکا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو یاد دلایا جائے یا اسے بذل و عطا پر آمادہ کیا جائے بلکہ بندے کی عاجزی کا ظہور مقصود ہوتا ہے علاوہ اسکے دعا ایک ایسا ارتباط ہے جس سے بڑھ کر خدا اور بندے میں کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا اور دعا سے عبودیت کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونیکا اقرار بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ دعا کرنے والا دل سے اسکا یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر اور میرے اس مقصد کے عطا کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ دعا کرنا قضائے الٰہی کے منافی اسلیئے نہیں ہے کہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی بندے کے دعا کرنے میں ہی ہو کہ بندہ جب عاجزی اور زاری کے ساتھ طلب کرے تو اسوقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا جائے

جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ
تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○
(یعنی تم لوگ اپنے رب سے دعا کیا کرو عاجزی
سے اور چپکے چپکے (البتہ یہ بات) واقعی (ہے کہ)
اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو (دعا
میں) حد (ادب) سے نکل جاتے ہیں (پ ر ۱۴) -

سوال نمبر ۹۱ - اِهْدِنَا (ہدایت کر ہماری)
کہہ دینا طلب ہدایت کیلئے کافی تھا مگر پھر اسکے
بعد صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (راستہ سیدھا) کی
صراحت کی کیا ضرورت تھی؟ **جواب** - چونکہ
ہر قسم کا راستہ دکھایا جا سکتا ہے گمراہی کا بھی
اور نیکی کا بھی مگر گمراہی کے راستے بہت ہیں
جس سے منع کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے
وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ (یعنی دوسری راہوں پر
نہ چلو (پ ر ۶) اور سیدھا راستہ اللہ تعالیٰ
کا راستہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَهٰذَا
صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا (اور یہی تیرے رب کا
سیدھا راستہ ہے (پ ر ۲) اسلئے اِهْدِنَا (بتلا
ہم کو) کے بعد نیکی کا راستہ صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ
(راستہ سیدھا) کا ذکر فرمایا گیا - تاکہ انسان صِرَاطِ
مُسْتَقِيْم (سیدھے راستہ جو اللہ تعالےٰ کا راستہ
ہے) پر چلنے کی دعا کرتا رہے جس کے بعد اس پر چلنا
اُسے جب نصیب ہوتا ہے تو اسکو ایسی سعادت
دارین ملجاتی ہے جسکی رہبری کیلئے دنیا میں انبیاء
علیہم السلام آئے تھے -

سوال نمبر ۹۲ - صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں صراط
کے بجائے طریق اور مُسْتَقِيْم کے بجائے اس کے
ہم معنی لفظ سَوِی کیوں نہ کہا گیا جبکہ "صراط"
کی طرح "طریق" کے معنی بھی راستہ کے ہیں اور
"مستقیم" و "سوی" ہر دو کے معنی سیدھے کے ہی
ہیں؟ **جواب** - لفظ صراط سے پل صراط کا خیال
پیدا ہوتا ہے جس پر سے قیامت میں وہی لوگ آسانی
چلیں گے جو اس دنیا میں شریعت پر آسانی کے ساتھ
چلتے ہیں گویا یہ شریعت قیامت کا پل صراط ہے -
جس کی یاد وہی شریعت پر چلنے کے لئے آمادہ کرنے کا
سبب ہوتی ہے مگر یہ مطلب لفظ طریق لانے سے حاصل نہیں
ہو سکتا تھا - اور لفظ سوی (یعنی سیدھا) کے بجائے
مستقیم لانے میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ
صرف ایکبار اخلاق حمیدہ سے متصف ہونا کافی نہیں
ہے بلکہ ان پر استقامت (ہمیشگی) ہونی چاہئے
جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد باری تعالےٰ ہے اِنَّ
الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (یعنی
جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کر لیا کہ ہمارا رب
اللہ ہے پھر (اسپر) مستقیم (ثابت) رہے (پ ۲۴
ر ۱۸) کیونکہ جس کام میں استقامت نہیں ہوتی
اسکا کچھ اعتبار نہیں ہوتا اسی واسطے مشہور ہے
الاستقامة فوق الكرامة یعنی استقامت
کرامت سے بڑھکر ہوتی ہے - پس لفظ مستقیم
لانے میں یہ اشارہ ہے کہ استقامت حاصل رہے

سوال نمبر ۹۳ - صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے کیا

مراد ہے؟ جواب ۔ اس سے مراد صاف اور واضح راستہ ہے جو کہیں سے ٹیڑھا نہو بعضوں نے اس سے اسلام مراد لیا ہے بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سنت والجماعت ہے ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد کتاب اللہ ہے" جس سے مطلب یہ ہوا کہ الٰہی ہم کو قرآن پر عمل کرنے کی توفیق دے بعضوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر چلنا ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ سمجھا ہم کو دینِ حق کسی نے کہا اس سے مراد حج کا راستہ ہے ۔ کسی نے کہا دکھا ہم کو جنت کے مستحقین کا راستہ ۔ الغرض سب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ و رسول کی اتباع حاصل ہو ۔ اور کہا جاتا ہے کہ صراط مستقیم سے مراد یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کی پیروی میں انسان اپنی سب توانائیاں بالکل خدا تعالےٰ کیلئے وقف کردے اور یہاں تک اپنے دل سے اسکی طرف متوجہ رہے کہ اگر اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہو کہ اپنے بیٹے کو ہمارے راستہ میں ذبح کردو تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کیطرح فرمانبرداری کرے اور اگر یہ ارشاد ہو کہ خود اپنی جان ہمارے راستہ میں نثار کردے تو وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح بہ طیب خاطر پوری خوشی کے ساتھ اسکو قبول کرلے ۔ اور اگر ارشاد ہو کہ اپنے کو سمندر میں جھونک دو تو حضرت یونس علیہ السلام کی طرح اطاعت الٰہی میں خود کو سمندر کے حوالے کردے ۔ اور اگر اعلیٰ منصب اور بلند ترین مرتبہ بخشنے کے بعد ارشاد باری تعالےٰ ہو کہ اپنے کو شاگرد بناکر ایک اجنبی شخص کے پاس جاکر ان سے کام کی باتیں سیکھو تو کسی قسم کا عار کئے بغیر وہ حکم کی تعمیل کرے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالےٰ کے حکم پر حضرت خضر علیہ السلام کے پاس گئے اور انکی شاگردی اختیار کی ۔

اور یہ کہ بندہ کو دنیا میں رہنے تک اسکے مشیروں اور رہنماؤں کی کشمکش رہتی ہے کیونکہ بیوی بچے ایک راستہ کی طرف بلاتے ہیں تو ماں باپ ایک طرف اور دوست دوسرے راستہ کی طرف اور دشمن و حاسد کسی اور راستہ کیطرف اور نفس و شیطان اپنی طرف بلاتے ہیں اور ہر اعتقاد اپنی طرف کھینچتا ہے تو عقل اپنے راستے کی طرف بلاتی ہے مگر انسان کی عمر مختصر اور اسکی عقل محدود ہوتی ہے اور اسکا میدان عمل تنگ ہے اسلئے وہ حیران ہوکر سیدھے راستہ کی ہدایت طلب کرتا ہے جو بندے کی انتہائی عاجزی اور کوتاہی و ناتوانی کے اقرار کو بھی ظاہر کرتا ہے ۔ وہ اسطرح کہ ناتوان آدمی ہی نزدیک کا راستہ تلاش کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ خط مستقیم ہی جو دو نقطوں کے درمیان فرض کیا جاتا ہے (جیسے ) تمام خطوط سے چھوٹا ہوتا ہے اسلئے صراط مستقیم (جو سیدھا راستہ ہوتا ہے اس) کے سوا دیگر تمام راستے دور کے ہونیکی وجہ بندہ اپنے میں چلنے کی ہمت نہیں پاکر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

(بتلا ہکو راستہ سیدھا) کہہ اٹھتا ہے جس سے
بندے کی انتہائی عاجزی کا اظہار اسطرح سے
بھی ہے کہ اِهْدِنَا میں راستہ کے صرف نشان
بتلانے کی استدعا ہے جو اس امر کو ظاہر کرتی
ہے کہ بندے میں مقصود تک لیجانے والے راستہ
پر چلنے کی بھی قدرت نہیں ہے جب تک کہ ہر وقت
اللہ تعالےٰ کی رہبری اور اسکی رفاقت و دستگیری
شامل حال نہ رہے۔

سوال نمبر ۹۴۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے اِهْدِنَا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ تک اگر شکر اور تعریف اور دعا کے
طور پر پڑھا جائے تو قرآن پڑھنے والا نہیں قرار
پاتا اور اگر بندوں کو تعلیم دینے کے طور پر جیسا کہ نزول
قرآن کا مقصد ہے پڑھا جائے تو شکر اور تعریف
اور دعا جسکا حکم ان آیات سے مفہوم ہوتا ہے
حاصل نہیں ہوتا پھر بتایئے کہ ان آیات کو کس حیثیت سے
پڑھا جائے؟ **جواب۔** جس حیثیت سے ان
آیات کا نزول ہوا ہے اس لحاظ سے پڑھنا
چاہیے۔ اور شکر و تعریف اور دعا کی بھی نیت
اس بنا پر کرے کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ
ان امور کا حکم ہے مثلاً اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ
یعنی مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کرونگا
(پ۲۴ ر۱۱) لہٰذا اسکی تعمیل پیش نظر رکھتے ہوئے
تلاوت کریں۔

سوال نمبر ۹۵۔ صِرَاط کو کتنے طریقوں سے
پڑھا جاتا ہے؟ **جواب۔** بعضوں نے صِراط
کو (س) سے "سراط" پڑھا ہے اور بعضوں نے
(ز) سے "زراط" بھی پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر
کے پاس جہاں بھی صراط آئے (س) سے ہی
پڑھا جاتا ہے۔

صراطِ مستقیم کے بارے
میں لوگوں کے خیالات مختلف ہوتے ہیں ہر شخص خود
جس راہ پر ہوتا ہے اسی کو صراط مستقیم سمجھتا ہے
اسلئے اسکی مزید وضاحت کے طور پر فرمادیا گیا کہ
اسکے بعد یہ بھی کہو

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ

صِرَاط۔ راستہ اَلَّذِیْنَ۔ جو۔ جن۔ اَنْعَمْتَ
انعام کیا تو نے۔ عَلٰی۔ پر۔ هُمْ۔ وہ سب
صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ یعنی راستہ
اُن کا جن پر تو نے انعام کیا۔

سوال نمبر ۹۶۔ نعمت کسے کہتے ہیں؟
جواب۔ لغت میں نَعمت (زبر کے ساتھ)
نرمی کو کہتے ہیں پھر اسی مناسبت سے حالت
سرور و لذت پر لفظ نِعمت (زیر کیساتھ) کہا جانے
لگا مگر اس سے ایسی چیزیں مراد لینے لگے جن سے
انسان کو راحت اور سرور پیدا ہوتا ہے اور
نعمت درحقیقت وہ منفعت ہے جو بطور احسان
دوسروں کو بے غرض طور پر پہنچائی جائے یعنی دوسروں
کو نفع پہنچانے میں اپنے کسی نفع کی غرض
شامل نہو۔ اس لحاظ سے منعم حقیقی صرف ذاتِ

باری تعالٰے ہے کیونکہ مخلوقات میں سے جو بھی کسی کو نفع پہنچاتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ اسے اپنی منفعت بھی ضرور پیش نظر رہتی ہے۔

سوال نمبر ۹۷۔ نعمت کی قسمیں کتنی ہیں؟

جواب۔ یوں تو اللہ تعالٰے کی نعمتیں بے شمار ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالٰے ہے وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اور اللہ تعالٰے کی نعمتیں اگر (انکو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے (پ ۱۳ ر ۱۱)۔ مگر انکی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں (۱) دنیوی (۲) اخروی پھر **دنیوی** کی دو قسمیں ہیں **ایک وہبی دوسری کسبی**۔ **وہبی نعمت** وہ ہے جس میں بندے کو کچھ دخل نہ ہو پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں **ایک روحانی** جیسے انسان کی روح کو پیدا کرنا پھر اسکے بدن سے اس کو متعلق کرنا جسکو **دنیاوی زندگی** بھی کہتے ہیں پھر قوی سے سرفراز فرمانا وغیرہ اور **دوسری جسمانی** جیسے انسان کا بدن پیدا کرنا اور اعضا کو کامل بنانا اور حوائج ضروری کا فراہم کرنا وغیرہ نعمتیں کافر و مومن نیک و بد سب کو ملی ہیں اور **کسبی نعمتیں** بھی بہت سی ہیں جیسے نفس کو اخلاق سے مزین کرنا۔ علم و صنعت اور طرح طرح کی آرائشیں پیدا کرنا۔ یہ اسلئے کسبی کہلاتی ہیں کہ کسی قدر اس میں بندے کے کام کو بھی دخل ہے اور **اخروی نعمتیں** بیشمار اقسام کی ہیں مثلاً بندے کو ہدایت و تقرب عطا کرنا اور اس کے گناہ معاف کرنا اور قیامت میں جنت دینا جس میں صدہا نعمتیں ہیں جنکو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی کے دل میں ان کا خیال گزرا پھر ایسی نعمتوں سے ہمیشہ متمتع ہونا اور دیدار الٰہی کا ہونا تو سب سے **بڑی نعمت** ہے اللّٰهُمَّ ارزقنا رؤيتك في الجنة۔ آمین

سوال نمبر ۹۸۔ ایمانداروں پر انعام الٰہی کس طرح کا ہوتا ہے اور کافر و فاسق لوگوں پر کس قسم کا؟ **جواب**۔ ایماندار لوگوں پر انعام الٰہی احسان کے طور پر ہوتا ہے مگر کافر و فاسق لوگوں پر بطور احسان نہیں ہوتا بلکہ ان کے حق میں وہ بظاہر نعمت ہوتی ہے لیکن درحقیقت بلا و آفت ہوتی ہے جیسے زہر ملا ہوا حلوہ جو بظاہر لذیذ لیکن اسکا اثر جان لینے والا ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالٰے فرماتا ہے وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال ہرگز نہ کریں کہ ہمارا انکو مہلت دینا انکے لئے بہتر ہے۔ ہم ان کو صرف اسلئے مہلت دے رہے ہیں تاکہ جرم میں انکو اور ترقی ہو جائے (پ ۴ ر ۹) دوسری جگہ ارشاد ہے وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (یعنی اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر

نہ دیکھئے جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں
کو انکی آزمائش کیلئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ
(محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے اور آپکے
رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملے گا) بدرجہا بہتر
اور دیرپا ہے (پ ۱۶ ر ۱۷) اور حقیقت بھی یہ ہے
کہ دنیا کے تمام عیش و عشرت جوانی ہو یا شہرت
حسن ہو یا دولت سب خواب و خیال کی طرح ہیں
چند روزہ زندگی کیا اور اسکی بہار کیتنی۔ انسان
دنیا میں کسی کمال کے حاصل کرنے کیلئے اس لئے
ہر طرح کی مشقت اٹھاتا ہے کہ اسکے بعد اسے
اسکا مفروضہ اعلیٰ درجہ دنیا میں مل جائے گر وہی
انسان آخرت کے ثواب کیلئے دنیا میں معمولی مشقت
سے بھی بھاگتا ہے جسکی وجہ صرف ایک ہو سکتی ہے
اور وہ یہ کہ قیامت پر کامل یقین نہیں ہے اس لئے
ہر مسلمان کو چاہئے کہ خدا و رسول کے احکام کو مانے
اور قیامت و جزا و سزا پر کامل یقین رکھے تو
پھر وہ اخروی نعمتوں سے بھی سرفراز ہو سکتا ہے۔

سوال نمبر ۹۹۔ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام
ہوا ہے ان سے مراد کون ہیں؟ **جواب**۔ ان کا
بیان خود اس آیۃ وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ
فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِم
مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ
وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقًا ۝
یعنی اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص
بھی ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے
یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحا
اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں (پ ۵ ر ۷)
میں فرمایا گیا ہے پس صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ
عَلَيْهِمْ کا مطلب یہ ہوا کہ اے خدا تو ہمکو نبیوں
اور اُن صدیقوں شہیدوں اور نیک لوگوں کی
راہ چلا جن پر تو نے اپنی طاعت و عبادت کیوجہ
سے انعام فرمایا ہے۔" کیونکہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے
والے راستے بھی مختلف ہوتے ہیں جن میں سے مسلمان
وہ راستہ چاہتے ہیں جو بہت سیدھا اور نزدیک تر ہو
اور وہ انہی کا راستہ ہے۔ بعض صوفیا نے کہا کہ
"فنا کے راستے سے زیادہ کوئی راستہ نزدیک کا نہیں
ہے حضرت والد ماجد فاضل مدظلہ فرماتے ہیں ؎

کسی کو لانے ضرورت ہے آپ جانے کی
خدا کے پانے کو حاجت خودی مٹانے کی

اور جس طرح شاہی دربار میں باریاب ہونے والے
مختلف مدارج کے ہوتے ہیں بعض عام درباری اور
بعض مقربین اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بھی بندے
مختلف ہوتے ہیں اسی لیے بندہ اِهْدِنَا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (بتلا ہمکو راستہ سیدھا)
کہہ کر عام درباریوں سے بڑھ کر خاص الخاص لوگوں
میں شامل ہونے کی دعا کرتے ہوئے عرض کرتا ہے
صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (راستہ انکا
جن پر تو نے انعام کیا) کیونکہ جو جماعت انعام ہی
انعام کی مستحق ہوتی ہے وہی محبوب ہوتی ہے یا
جو انعام یافتہ ہوتی ہے وہی بہتر راستے پر

ہوتی ہے۔

انتباہ یہ کلامِ الٰہی ہے جس کا صحیح پڑھنا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے۔ بعض لوگ اس کے زیر، زبر، پیش کی غلطیوں کو معمولی سمجھکر اسلئے کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ انہیں اسکی خبر نہیں کہ انکی ایسی لاپرواہی سے کسقدر الٹے معنی ہوکر کیسی ناقابل تلافی غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ جس سے مسلمان رہنے کے بجائے کافر ہونیکا اندیشہ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اس آیتہ میں بھی لفظ (۱) اَنْعَمْتَ (انعام کیا تونے) اسی طرح کا لفظ ہے جس میں "ت" کو زبر کے بجائے پیش سے (اَنْعَمْتُ) پڑھنا اسلئے موجب کفر ہوتا ہے کہ اسکے معنی (الٰہی! راستہ اُن لوگوں کا چلا) جن پر میں نے انعام کیا ہے"۔ کے ہوتے ہیں اسلئے قرآن مجید کی ان آیات کو بھی اس سلسلہ میں مع ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے جنکے اعراب کی غلطی کفر تک پہنچادینے والی ہوتی ہے۔ تاکہ ہر مسلمان کم از کم درج کردہ الفاظ کو بطور خاص صحیح اعراب کے ساتھ پڑھ لیا کرے۔ چنانچہ (۲) وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ (اور جس وقت آزمایا (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کو انکے رب نے (پ۱ ر۱۵) میں "م" کو زبر کے بجائے پیش سے پڑھیں اور رَبُّهٗ کی "ب" کو پیش کے بجائے زبر پڑھ دیں تو موجب کفر ہوتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں معنی بالکل الٹے ہوجاتے ہیں وہ یہ کہ "جس وقت آزمایا (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے رب کو" اور یہ صریحاً غلط ہیں۔ (۳) وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ اور (حضرت) داؤد (علیہ السلام)

نے جالوت کو قتل کرڈالا (پ۲ ر۱۶) میں داؤد کے آخری "د" کو پیش کی جگہ زبر اور جالوت کی "ت" کو زبر کے بجائے پیش پڑھے تو اسلئے غلط ہوجاتا ہے کہ معنی بدل جاتے ہیں وہ یہ کہ "جالوت نے داؤدؑ کو قتل کیا" جو واقعہ کے خلاف ہے۔ (۴) وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ (اور اللہ تعالےٰ دونا کرتا ہے (پ۳ ر۴) میں "ع" پر زبر پڑھیں تو کافر ہوجائیں کیونکہ ایسی صورت میں یہ معنی ہوتے ہیں کہ "اور اللہ تعالےٰ کو دونا دیا جاتا ہے"۔ یہ کلمہ کفر ہے۔ (۵) رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔ (پیغمبر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے (پ۶ ر۳) کی "ذ" پر بجائے زیر کے زبر پڑھیں تو معنی بدل جاتے ہیں وہ یہ کہ "پیغمبر خوشخبری دینے والے اور ڈرائے گئے ہوئے" حالانکہ پیغمبر عذاب الٰہی سے ڈراتے ہیں نہ کہ ڈرائے جاتے ہیں۔ اسکی اہمیت اس (۶) آیتہ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ○ (اور ہم نے ان میں بھی ڈرانے والے (پیغمبر) بھیجے تھے۔ پس دیکھ لیجئے ان لوگوں کا کیسا (برا) انجام ہے جنکو ڈرایا گیا تھا (پ۲۳ ر۶) سے بھی ظاہر ہوتی ہے جس میں پہلے "ذ" کو زبر اور دوسرے "ذ" کو زیر سے پڑھیں تو معنی بالکل الٹ جاتے ہیں اور ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ "ہم نے ان میں بھی ڈرائے گئے ہوئے (یعنی کافر) لوگوں کو بھیجا تھا پس دیکھ لیجئے ان لوگوں کا کیسا (برا) انجام ہوا جنھوں نے (خدا تعالےٰ کے عذاب سے) ڈرایا تھا"۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ نعوذ باللہ پیغمبروں کا برا انجام ہوا ہے اسلئے

ایسے اعرابی غلطی سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

نوٹ:- قرآن مجید پڑھتے وقت اس کا ضرور خیال رکھا جائے کہ جہاں کہیں اس طرح کے الفاظ جیسے مُرْشِدًا (نیک راستہ بتانے والا (پ۱۵ ر۱۴) اور اگر شین کو زبر سے پڑھیں تو اسکے معنی "نیک راستہ بتایا گیا ہوا یعنی مرید" کے ہوتے ہیں) اور مُخْلِصِیْنَ (لام کے زیر سے معنی ہوتے ہیں خالص کرنے والے (پ ر۱۰) اور لام کے زبر سے مُخْلَصِیْنَ (کے معنی ہوتے ہیں خالص کئے گئے ہوئے (پ۲۳ ر۱۳) اور مُرْسِلُ (سین کے زیر سے معنی ہوتے ہیں" بھیجنے والا (پ۲۰ ر۱۳) اور سین کے زبر سے مُرْسَلُ (کے معنی ہوتے ہیں بھیجا ہوا (پ ر۱۷) اور مُسْتَقَرٌّ (قرار پکڑنے کی جگہ (پ ر۱۲) اور "ق" کے زیر سے مُسْتَقِرٌّ (ٹھیرنے والا قرار پکڑنے والا پ۲۲ ر۸) وغیرہ آئیں تو انکو اسی طرح پڑھیں جیسا کہ لکھا ہوا ہو ورنہ معنی میں بالکل تبدیلی ہو جاتی ہے۔

مخفی نہ رہے کہ عام بول چال میں بھی بعض لفظ جیسے ملزم ایسے کے لئے استعمال کرتے ہیں جس پر جرم ثابت ہوا ہے حالانکہ ملزم اسکو کہنا چاہیئے جس نے فرد جرم لگائی ہے یعنی جج ملزم ہوتا ہے اور مرتکب جرم ملزم ہوتا ہے اسلئے کہ ملزم اسکو کہتے ہیں جس پر الزام لگایا جائے

(۷) وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (یعنی وہ (اللہ تعالیٰ) ہی کھلاتا ہے اور اسے کوئی نہیں کھلاتا (پ ر۸) میں پہلے یطعم کی "ع" کو زبر اور دوسرے یطعم کی "ع" کو زیر سے پڑھیں تو صریح کفر ہوتا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "وہ (اللہ تعالیٰ کو) کھلایا جاتا ہے اور وہ (اللہ تعالیٰ) نہیں کھلاتا

(۸) وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (یعنی اور ہم (کبھی) سزا نہیں دیتے جب تک کہ کسی رسول کو نہیں بھیج لیتے (پ۱۵ ر۲) کی "ذ" پر زبر پڑھیں تو معنی یہ ہوتے ہیں کہ" اور ہم کبھی سزا نہیں دئے جاتے" جس سے خدا تعالیٰ کیلئے سزا دئے جانے کا استعمال ہوتا ہے جو کفر ہے اور ایسا کہنا والا کافر ہو جاتا ہے۔

(۹) اِنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ (بیشک اللہ تعالیٰ بیزار ہے مشرکوں سے اور اسکا رسول بھی (بیزار ہے) (پ۱۰ ر۷) میں رسولہ کے "ل" کو پیش سے نہ پڑھیں تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ بیزار ہے مشرکوں سے اور اپنے رسول سے" جو بالکل غلط اور موجب کفر ہے۔

(۱۰) وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ (اور نافرمانی کی (حضرت) آدم ؑ نے اپنے رب کی (پ۱۶ ر۱۶) کی "ب" کو پیش پڑھے یا "م" کو زبر تو کافر ہو جاتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ" اسکے پروردگار نے آدم ؑ کی نافرمانی کی" جائے غور ہے کہ صرف زبر اور پیش کے ردوبدل سے کسقدر غلط معنی ہو گئے۔

(۱۱) لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ○ (یعنی وہ (اللہ تعالیٰ) جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا اور وہ (لوگ) باز پرس کئے جاتے ہیں (پ۱۷ ر۲) میں یُسْئَلُوْنَ کی "ی" کو پیش کی بجائے زبر سے پڑھیں تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے باز پرس کرتے ہیں" اور ایسا کہنا صریحاً غلط اور باعث

کفر ہے۔ (۱۲) اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (یعنی بیشک میں قصوروار ہوں (پ ۱۷ ر ۶) کی "ت" پر زبر پڑھنے سے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اے خدا بیشک تو قصوروار ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

نوٹ:۔ یہ کُنْتُ (پ ر ۶) یا ظَلَمْتُ (پ ۱۹ ر ۸) یا ظَنَنْتُ (پ ۲۹ ر ۵) جیسے الفاظ جہاں بھی قرآن مجید میں آئیں تو اسکے آخری "ت" کا اعراب بطور خاص صحیح پڑھنا چاہئے کیونکہ اس "ت" کے اعراب سے بہت بڑی معنوی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے وہ یہ کہ زبر پڑھیں تو مذکر حاضر کا صیغہ ہوتا ہے اور اسکو زیر دیکر پڑھیں تو مونث حاضر کا اور پیش سے پڑھیں تو واحد متکلم کا صیغہ بنجاتا ہے۔ (۱۳) اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (یعنی سوائے اسکے نہیں کہ ڈرتے ہیں اللہ تعالٰے سے وہی بندے جو عالم ہیں (پ ۲۲ ر ۱۶) کے لفظ اللہ کی "ہ" پر پیش پڑھے اور عُلَمٰٓؤُا کی ہمزہ پر زبر تو صریحًا کفر کلمہ بنجاتا ہے اس لئے کہ اسکے معنی "سوائے اسکے نہیں کہ اللہ تعالٰے ڈرتا ہے اپنے عالم بندوں سے" کے ہوجاتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک (۱۴) ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (یعنی وہ اللہ پیدا کرنے والا ہے ٹھیک بنانے والا ہے یعنی ہر چیز کو حکمت کے موافق بناتا ہے صورتیں بنانے والا ہے (پ ۲۸ ر ۶) میں مُصَوِّر کی "و" پر زبر پڑھنے سے معنی اُلٹے ہوجاتے ہیں وہ یہ کہ "(اس اللہ تعالٰے کی) صورت بنی ہوئی ہے"۔ اور ایسا کہنا بالکل غلط ہے (۱۵)

فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ (یعنی فرعون نے رسول کی نافرمانی کی (پ ۲۹ ر ۱۳) میں اگر "ن" کو زبر اور "ل" کو پیش سے پڑھیں تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ رسول نے فرعون کی نافرمانی کی" جو بالکل برعکس اور موجب کفر ہوتا ہے۔

حکایت | حضرت امام ابوبکر نقاشؒ سے ایک یہودی نے کہا کہ "تمہاری کتاب (قرآن مجید) میں ایک آیتہ سمجھنا میرے لئے مشکل ہوگیا اگر کوئی اسکی تفسیر کرکے اور میری مشکل کو حل کردے تو میں مسلمان ہوجاتا ہوں" امام نے پوچھا "وہ کیا ہے" اس نے کہا "تم کہتے ہو" اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (یعنی بتلا ہمکو راستہ سیدھا) تو جب تم اپنے دین کے متعلق کچھ شبہہ نہیں رکھتے اور سیدھے راستے کو اپنے دین ہی میں سمجھتے ہو تو پھر کس لئے ایسی چیز کی تلاش کرتے ہو جو خود تمہارے دین میں موجود ہے؟ امامؒ نے جواب دیا کہ "پیغمبروں کی جماعت اور اللہ تعالٰے کے وہ چلنے والے جو ہم سے پہلے جنتی بنے اور ہمیشگی کی سعادت حاصل کی انکے راستہ پر ہمارے قائم رہنے کی ہم اللہ تعالٰے سے دعا کرتے ہیں جیسا کہ اسکے بعد ہی کی آیتہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (یعنی راستہ ان کا جن پر تونے انعام کیا) سے ظاہر ہے"۔ آپکی اس تفہیم سے اسکا شک جاتا رہا اور وہ مسلمان ہوگیا۔

سوال نمبر ۱۰:۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (راستہ انکا جن پر تونے انعام کیا) میں بندوں کو کیا تعلیم دیگئی ہے؟ **جواب**: اس آیتہ

میں اس طرف اشارہ ہے کہ انعام یافتہ یعنی سلف صالح کا مقتدی بننا اچھا ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ انبیا علیہم السلام کے ذکر کے بعد اللہ تعالے فرماتا ہے اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ ۵ (یعنی یہ حضرات ایسے تھے جنکو اللہ تعالے نے ہدایت کی تھی پس آپ بھی انہی کے طریق پر چلیے (پ ۷ ر ۱۶) اسی طرح جب اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (بتلا ہمکو راستہ سیدھا) کہہ کر بندہ راستہ کو طلب کرتا ہے تو سیدھے راستے کو دریافت کرنا چونکہ انبیا علیہم السلام کی رہبری اور صدیقین شہداء اور صالحین کی رفاقت کے بغیر دشوار ہے اسواسطے صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (راستہ انکا جن پر تونے انعام کیا) کہنے کی تعلیم دی تاکہ اس سے یہ ظاہر ہو کہ بندہ انعام الٰہی پائے ہوئے گروہ کی ہمراہی اور انکے مقتدی بننے کی درخواست کرتا ہے۔

شبہہ: سوال نمبر ۹ میں انعام الٰہی پائے ہوئے چار گروہ (۱) انبیا علیہم السلام (۲) صدیقین (۳) شہداء (۴) صالحین بیان ہوئے ہیں جن کے الگ الگ نام اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے راستے بھی الگ الگ ہونگے۔ کیونکہ پیغمبر کی شریعت الگ اور ہر ولی کے اشغال اور طریقہ اذکار بھی جدا ہوتے ہیں تو پھر ان سب کے راستوں کو ایک اور سیدھا کہنے کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ **جواب:** جس طرح ایک قافلہ میں الگ الگ نوعیت کے مسافر ہوتے ہیں مثلاً کوئی رہنما ہوتا ہے تو کوئی کاریگر، کوئی حکیم تو کوئی حاکم مگر اسکے باوجود سب کا راستہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح اگرچہ یہ چاروں بیان کردہ گروہ ناموں کے جدا ہونے کی وجہ سے الگ الگ ہیں مگر سب ایک ہی قافلہ کے افراد ہیں جنکا راستہ صراط مستقیم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالے نے صِرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (راستہ سیدھا) کے بعد صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (راستہ انکا جن پر تونے انعام کیا) لاکر اس طرف ایک لطیف اشارہ فرمایا ہے کہ سیدھے راستہ سے مراد انکا راستہ ہے جن پر اللہ تعالے نے انعام فرمایا ہے اور وہ لوگ انبیا ہیں اور صدیقین ہیں اور شہداء و صالحین ہیں۔ لہذا انکے راستہ پر چلنے کی دعا سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان سب کا راستہ ایک نہیں ہے انمیں سے جس کا راستہ بھی اختیار کیا جائے وہ ضرور صراط مستقیم (سیدھا راستہ) ہوتا ہے کیوں کہ ہر نبی کی پیروی انکی شریعت منسوخ ہونے تک رضائے الٰہی کے موافق ہوتی ہے ف۔ اور ہر ولی کے اشغال و اذکار

ف اس مقام پر جو شبہہ پیدا ہوتا ہے اسکا مدلل جواب میں نے اپنی کتاب "علم افزا" میں دیا ہے جسے دیکھکر ناظرین کرام اپنی تشفی فرما سکتے ہیں۔ تاہم یہاں اس حد تک لکھدیا جاتا ہے کہ "انبیا علیہم السلام کی شریعتوں کا اختلاف در اصل دین کا اختلاف نہیں ہے کیونکہ ہر پیغمبر کے دین میں توحید اور اقرار رسالت ضروری ہیں جو اصل دین ہیں البتہ انکے طریقے اور شرایع و احکام ہر ایک کی امت کی استعداد کی مناسبت سے ہر وقت کے مصالح کے مدنظر بدلتے (باقی بر صفحہ دیگر)

خواہ الگ نوعیت کے ہوں مگر سب میں ذکرِ الٰہی چونکہ موجود ہوتا ہے اسلئے صدیق ہوں یا شہید اور صالحین سب کے عمل رضائے الٰہی کی طلب کے لئے ہوتے ہیں اور یہ سب مقبولِ الٰہی ہونے کی وجہ ایک ہی اور سیدھے راستے کے چلنے والے قرار پاتے ہیں۔

یا یہ کہ جس طرح ہر معالج کی معمولاتِ مطب ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں مگر سب کا راستہ (یعنی مرض کو دفع کرنا اور زائل شدہ صحت کو بحال کرنے کا مقصد) ایک ہی ہوتا ہے اسی طرح بیان کردہ چار گروہ الگ الگ ہیں مگر سب کا راستہ سیدھا اور ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہو۔

سوال نمبر ۱۰۔ انسانی قوتوں کی بڑی بڑی کتنی قسمیں ہیں اور ہر ایک کا درمیانی طریقہ استعمال کیا ہے جسے اس دعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (بتلا ہم کو راستہ سیدھا) میں طلب کیا گیا ہے اور پھر اسکو صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (راستہ انکا جن پر تو نے انعام کیا) سے کیا مناسبت ہے؟ **جواب۔** انسان کی وہ ذاتی قوت جو روح کو بدن سے تعلق پیدا ہونے سے پہلے حاصل تھی اس کا نام "قوتِ نطقیہ" ہے جس کا دوسرا نام "عقلیہ" (جو اشیاء کو جانتی اور حقائق کو دریافت کرتی) ہے اور باقی دو قوتیں یعنی "قوتِ شہویہ" اور "قوتِ غضبیہ" انسان کو اسوقت حاصل ہوتی ہیں جبکہ روح کا تعلق بدن سے ہو جاتا ہے پس قوتِ عقلیہ کا کمال توسط یہ ہے کہ اسکا استعمال اس حد تک کیا جائے کہ اس سے زیادہ ممکن نہ ہو۔ اور قوتِ شہویہ اور قوتِ غضبیہ کا متوسط استعمال یہ ہے کہ انکا صرف بقدرِ ضرورت استعمال کیا جائے یعنی اسقدر کم جس سے کمتر ممکن نہ ہو چونکہ ان قوتوں کے استعمال کا متوسط طریقہ اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جبتک کہ انبیاء علیہم السلام کی رہبری نہ ہو اور صدیقین و شہداء اور صالحین کی رفاقت نصیب نہ ہو اسلئے صِرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (راستہ سیدھا) کی وضاحت صِرَاطَ الَّذِیْنَ

(بقیہ صفحہ ماقبل) رہے ہیں جس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے طاعون کے زمانہ کا معالج چوہوں کے مارنے کی رائے دیتا ہے اور ہیضہ کے زمانہ کا معالج چوہوں کے مارنے پر کوئی توجہ نہیں کرتا بلکہ اشیائے خورد و نوش پر کافی نگرانی پر زور دیتا ہے مگر باوجود اس کے عقلِ سلیم رکھنے والا جس طرح ہر زمانۂ وبا کے معالج کو آپس میں اختلاف کرنے والا نہیں کہتا اسی طرح یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ سب پیغمبروں کی شریعتیں ایک کیوں نہ ہوئیں اور سب کی شریعت کا اختلاف انکے ایک راہ پر ہونے کے مغائر ہے۔ کیونکہ فرض کیجیئے کہ زمانہ طاعون کا معالج اگر ہیضہ کے زمانہ میں ہوتا تو وہ بھی بجائے موش کشی (چوہوں کو مارنے) کے زمانہ کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے کھانے پینے کی چیزوں کی احتیاط پر متوجہ کرنے والے معالج کا ضرور ہم خیال ہوتا۔ ایسا ہی اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوتے تو ضرور آپ کی اتباع کرتے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَا وَسِعَہٗ اِلَّا اِتِّبَاعِیْ۔

اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ (راستہ اُنکا جن پر تو نے انعام کیا) یعنی انبیا صدیقین شہداء صالحین) سے کیگئی ہے۔

سوال نمبر ۱۰۲ - اَنۡعَمۡتَ (انعام کیا تو نے) کے لفظ میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں اور اس کے ساتھ انعام کی صراحت کس لئے نہیں فرمائی گئی؟

جواب (۱) اَنۡعَمۡتَ (انعام کیا تو نے) ماضی (یعنی گزرے ہوئے زمانہ) کا صیغہ ہے اگر اس کے بجائے مستقبل (آنے والا زمانہ) کا صیغہ استعمال کیا جاتا تو اللہ تعالٰے کے انعام واقع ہونے میں شک کا شائبہ پایا جاتا اسلئے اَنۡعَمۡتَ (انعام کیا تو نے) فعل ماضی کا صیغہ لاکر اللہ تعالٰے کی نعمتوں سے مستفید ہونے پر شک کو دور کیا گیا ہے (۲) اور پھر اس میں انعام کی نسبت کو اللہ تعالٰے نے اپنی طرف فرمائی ہے جس سے انعام کی وقعت وشان ظاہر ہوتی ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالٰے ہر حیثیت سے کامل ہے اور کامل سے جو چیز ملے وہ بھی ضرور کامل ہوتی ہے پس اَنۡعَمۡتَ (انعام کیا تو نے میں کامل انعام کی طرف اشارہ ہے (۳) پھر یہ حاضر کا صیغہ ہے جسے لاکر یہ بتلایا گیا ہے کہ "بندہ جب اپنے کو اللہ تعالٰے کے دربار میں حاضر کرے تو اسکو پھر دربار الٰہی سے غائب نہ ہونا چاہئے۔

سوال نمبر ۱۰۳ - اس آیۃ کی تلاوت ہدایت یافتہ کی طرح کیا گمراہ کیلئے بھی موزوں ہو سکتی ہے؟

جواب - یہ ایسی دعا ہے جس سے گمراہ اور ہدایت یافتہ ہر دو قسم کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ اسطرح کہ گمراہ جب یہ آیۃ پڑھتا ہے تو وہ گویا یہ درخواست کرتا ہے کہ "الٰہی! مجھے سیدھا راستہ دکھا راستہ اُنکا جن پر تو نے انعام کیا۔" اور ہدایت یافتہ جب یہ پڑھتا ہے تو گویا یہ مانگتا ہے کہ "خدایا! جس ہدایت کے راستہ پر میں چل رہا ہوں اس میں ثبات اور ترقی عطا فرما۔" اور یہ مسلم ہے کہ اللہ تعالٰے کے قرب (نزدیکی) کے مقامات غیر محدود ہیں اسی لئے بڑے بڑے بزرگ اور پیغمبر بھی اس دعا کے محتاج ہیں۔ اور وہ دنیوی اور دینی ہر ضرورت کے پورا کرنے کیلئے بھی یہ دعا اسلئے کیجا سکتی ہے کہ اس میں کسی خاص چیز کا نام نہیں لیا گیا ہے کہ وہ ہمیں مل جائے بلکہ عام لفظ رکھے گئے ہیں جس کی وجہ سے یہ دعا ہر ایک کے لئے کارآمد ہو سکتی ہے۔

نوٹ:- دلی مقصد کو جب اعلیٰ ہستی اپنے سے کم درجہ والے سے طلب کرے تو اُسے "امر" یعنی حکم کہتے ہیں اور جب کم درجہ والا اپنے سے اعلیٰ ہستی سے مقصد دلی حاصل کرتا ہے تو اسے "دعا" کہتے ہیں اور جب برابر والے آپس میں ایک دوسرے سے طلب کریں تو اُسے "التماس" کہتے ہیں۔

مخفی نہ رہے کہ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ (راستہ اُنکا جن پر تو نے انعام کیا) کہنے والوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اپنے کو خلاف واقع بھی کسی پیغمبر یا اپنے کسی خود ساختہ پیشوا کا تابع خیال کر کے اپنے کو سیدھی راہ پر سمجھتے ہوں اس واسطے اس شبہہ کو دور کرنے کیلئے فرمادیا کہ اس کے

بعد اے میرے بندو تم کہو

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ○

غَیْرِ۔ نہ۔ نہیں۔ مَغْضُوْب۔ غصہ کیا گیا۔ عَلَیْهِمْ۔ ان پر۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ یعنی نہ انکا جن پر تیرا غصہ کیا گیا۔ وَ۔ اور لَا۔ نہ۔ نہیں۔ ضَآلِّیْنَ۔ راستہ بھٹکے ہوئے وَلَا الضَّآلِّیْنَ یعنی اور نہ انکا جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے معنی ہوئے۔ نہ انکا (راستہ چلا) جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور نہ انکا جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

سوال نمبر ۱۰۱۔ مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (جن پر اللہ تعالیٰ کا غصہ کیا گیا) سے اور ضَآلِّیْنَ (راستہ بھٹکے ہوئے اور گمراہ) سے کون مراد ہیں؟

جواب۔ مفسرین نے ان دونوں فرقوں کے تعین میں اختلاف کیا ہے کسی نے کہا مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (جن پر اللہ تعالیٰ کا غصہ کیا گیا) سے مراد گنہگار ہیں اور ضَآلِّیْنَ (راستہ بھٹکے ہوئے) سے مراد جاہل ہیں اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور نیک عمل دونوں جسکو عنایت ہوں وہ نعمتِ الٰہی سے فیض پایا ہوا ہوتا ہے۔ اور جسکو اللہ تعالیٰ کی معرفت تو نصیب ہے مگر وہ نیک عمل نہیں کرتا تو وہ فاسق ہے اور فاسق غضب کا سزاوار ہوتا ہے۔ اور ایسا شخص جو نیک عمل کرتا ہے مگر جاہل ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اُسے نصیب نہیں ہے تو ضال یعنی گمراہ ہے۔ **یا یہ** کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (جن پر اللہ تعالیٰ کا غصہ کیا گیا) سے دو فرقے مراد ہیں (۱) عناد اور بغض رکھنے والے وہ کافر جو دیکھ سمجھ کر بھی عمداً دینِ حق کا انکار کرتے ہیں۔ (۲) وہ گنہگار جو جان بوجھکر بھی عمداً گناہ کرتے ہیں۔ اور ضَآلِّیْنَ (راستہ بھٹکے ہوئے) بھی دو طرح کے ہوتے ہیں **ایک** ایسے کافر جنکی عقل و نظر کم ہونیکی وجہ حقیقت دین سے ناواقف رہ کر دوسرے کافروں کی تقلید کرتے ہوئے خود بھی کافر بنتے ہیں **دوسرا** وہ گنہگار جو اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اسکے کرم پر بھروسہ کرکے گناہ کرتے رہتے ہیں یا یہ کہ ایسے لوگ جو علم کے حاصل کرنے میں سستی کرتے ہیں اور اہل علم سے اپنے شکوک و شبہات بیان کرکے اسے دور کرنیکی کوشش نہ کرکے[1] گناہوں کے مرتکب بنتے ہیں۔ **بعض** نے کہا کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (جن پر اللہ تعالیٰ کا غصہ کیا گیا) سے مراد ایسی جماعت ہے جنکو قیامت میں عذاب دیا جائیگا اور ضَآلِّیْنَ (راستہ بھٹکے ہوئے) سے مراد وہ جماعت ہے جن سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے کی امید ہے **بعض** نے کہا کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (جن پر اللہ تعالیٰ کا غصہ کیا گیا) سے مراد ایسے لوگ ہیں جنہوں نے سچے

---

[1] حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ○ یعنی پس اگر تم کو علم نہیں تو (دوسرے) اہل علم سے پوچھو (پ۱۴ ر۱۱)۔

اعتقاد اور اچھے اعمال میں تفریط (کمی) اختیار کی مثلاً کسی نے فاتحہ جو اعمال حسنہ میں شامل ہے اس کے بارے میں کوتاہی کی یا نفل عبادتوں کو ترک کرنا اپنے لئے ضروری سمجھا تو یہ غضب الٰہی کا سبب ہوتا ہے۔ اور ضَالِّیْنَ (راستہ بھٹکے ہوئے) سے مراد ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس میں افراط (زیادتی) سے کام لیا مثلاً بزرگوں کی تعظیم میں اسقدر غلو کیا کہ ان کی قبروں کی پرستش شروع کر دی یا انکا طواف کرنے لگے۔ **بعضؒ** کہتے ہیں کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (جن پر اللہ تعالیٰ کا غصہ کیا گیا) سے وہ لوگ مراد ہیں جنکے اعمال ظاہرہ میں خطا واقع ہو اور ضَالِّیْنَ (راستہ بھٹکے ہوئے) سے وہ لوگ مراد ہیں جو اعتقاد میں خطا کرنے والے ہوں۔ اور حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (جن پر اللہ تعالیٰ کا غصہ کیا گیا) سے کون مراد ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ "اس سے مراد یہود ہیں"۔ آپ نے پوچھا ضَالِّیْنَ (راستہ بھٹکے ہوئے) سے مراد کون ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نصاریٰ اس سے مراد ہیں"۔ اور یہی قول تمام صحابہؓ کا ہے۔

سوال نمبر ۱۰۵۔ مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (جن پر اللہ تعالیٰ کا غصہ کیا گیا) سے یہود اور ضَالِّیْنَ (راستہ بھٹکے ہوئے) سے نصاریٰ مراد ہونے کی کیا وجوہ ہو سکتی ہیں؟ **جواب۔** یوں تو یہود و نصاریٰ دونوں مغضوب اور گمراہ ہیں مگر ہر ایک کا ایک ایک وصف خاص ہے منجملہ انکے یہود کے اوصاف میں سے **ایک یہ** ہے کہ وہ مسلمانوں کی دشمنی میں بہت شدید ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا (البتہ تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ یہود کو اور مشرکین کو پائیں گے (پ ۷ ر ۱۵) **دوسرا یہ** کہ یہود کافروں سے زیادہ کفریہ کلمات کہتے ہیں سخت ہیں وہ اسطرح سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسے الفاظ کہتے ہیں جسے کافر بھی کہنا پسند نہیں کرتا چنانچہ قرآن مجید میں ہے قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَاءُ (انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم مالدار ہیں (پ ۴ ر ۱۰) اور وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (اور یہود نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بند ہو گیا ہے (پ ۶ ر ۱۳) وغیرہ جیسے الفاظ کی وجہ یہود غضب الٰہی سے مخصوص ہوئے۔ **تیسرا یہ** کہ یہود کے بارے میں دوسرے مقام پر قرآن مجید میں صراحتاً غضب الٰہی کا ذکر بھی آیا ہے جیسے وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے (پ ۱ ر ۷)۔ اور ضَالِّیْنَ (راستہ بھٹکے ہوئے) سے مراد نصاریٰ ہیں کیونکہ انکو تصریح کے ساتھ غضب الٰہی کے قابل اسلئے نہیں کہا گیا کہ یہ مسلمانوں سے دشمنی کم کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

لے جس کے قابل ثواب ہونے کے متعلق میں نے کتاب "جواز فاتحہ" میں مدلل بحث کی ہے ۱۲

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ط (اور ان میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر ان لوگوں کو پائیں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں (پ۷ ر۱۵) اور یہ یہود جیسے دشمن نہیں۔۔ انمیں تکبر کم ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انکے بارے میں ضلال (گمراہی) کی صفت بیان بھی فرمائی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ ○ (جو پہلے خود بھی غلطی میں پڑ چکے ہیں اور بہتوں کو غلطی میں ڈال چکے ہیں اور وہ لوگ راہ راست سے دور ہو گئے تھے (پ۶ ر۱۴) غرض احادیث کے علاوہ خود کلام الٰہی سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ (جن پر (اللہ تعالیٰ کا) غصہ کیا گیا) سے مراد یہود اور ضَالِّينَ (راستہ بھٹکے ہوئے) سے مراد نصاریٰ ہیں۔

سوال نمبر ۱۰۶۔ مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ (جن پر (اللہ تعالیٰ کا) غصہ کیا گیا) کو ضَالِّينَ (راستہ بھٹکے ہوئے) سے پہلے لانے میں کس طرف اشارہ ہے؟

جواب۔ (۱) نصاریٰ سے پہلے یہود ہوئے ہیں اسلئے یہود کی صفت بیان کی گئی اسکے بعد نصاریٰ کی (۲) یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت میں ضَالِّينَ (راستہ بھٹکے ہوئے) سے مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ (جن پر (اللہ تعالیٰ کا) غصہ کیا گیا) کی تباہ حالی بہت زیادہ ہوگی کیونکہ جو زیادہ عذاب کے قابل ہو اسکا ذکر پہلے ہوا کرتا ہے جیسے تمام کبیرہ گناہوں میں شرک کو پہلے شمار کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ عذاب کا باعث ہے اور نصاریٰ سے بڑھکر یہود رسوا ہونگے! اسلئے قرآن مجید میں جس قوم پر غضب الٰہی کا ذکر آئے تو اس سے اس قوم کے سخت برے انجام کا پتہ چلتا ہے۔

سوال نمبر ۱۰۷۔ غضب کسے کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے کیا مراد ہے؟ **جواب۔** انسان کی اس صفت کا نام غضب ہے جس میں روح دشمن کو دفع کرنے اور اسے مغلوب کرنیکے لئے متوجہ ہوتی ہے اور خون میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب غضب یا اس جیسے اوصاف مثلاً استہزا، حیا، سرور وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے تو اس سے اس صفت کی غایت مراد لیجاتی ہے۔

واضح ہو کہ تمام اغراض نفسانیہ اور احوال جسمانیہ مثلاً رحمت غضب وغیرہ جیسے الفاظ کیلئے دو مرتبے ہوا کرتے ہیں (۱) اوائل (۲) غایات۔ مثلاً غضب کا مرتبۂ اول یہ ہے کہ خون دل جوش میں آئے اور اسکی غایت اس شخص کو ضرر پہنچانا ہے جس پر یہ غصہ ہو رہا ہے۔ پس لفظ غضب اللہ تعالیٰ پر محمول ہو سکتا ہے مگر مرتبہ اول (خون دل جوش مارنے) کی حیثیت سے نہیں بلکہ غایت (مخالفوں کو ضرر پہنچانے) کے اعتبار سے ہے۔ اسی طرح حیاء کا مرتبۂ اول وہ عاجزی و انکساری ہے جو نفس میں حاصل ہوا کرتی ہے اور اسکی غایت یہ ہے کہ اس قابل حیا فعل کو ترک اور ناپسند کیا جائے پس لفظ حیا جب ذات باری تعالیٰ کیلئے بولا جاتا ہے تو اس سے انکسار نفس اور اسکی عاجزی مراد نہیں

ہوتی۔ بلکہ اُسے ناپسند کرنا مراد ہوتا ہے اسی اصول کے تحت اللہ تعالےٰ کی ایسی سب صفات کے مطالب سمجھنا چاہئے۔ چونکہ اللہ تعالےٰ کے اوصاف بیان کرنے کی جب ضرورت پڑتی ہے تو مجبوراً وہی الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں جو بندوں کی صفات کیلئے وضع کئے گئے ہیں۔ اسواسطے یہاں بھی اللہ تعالےٰ کے غضب کے مفہوم کو ظاہر کرنے کیلئے لفظ غضب ہی استعمال کیا گیا ہے۔

سوال نمبر ۱۰۸۔ ضَالّ سے کیا مراد ہے؟

جواب۔ ضَالّ ایسے کو کہتے ہیں جو عمداً ہو یا غلطی سے اس راستہ پر چلتا ہے جس سے مقصود کو نہ پہنچے اور یہ ہدایت کی ضد ہے۔ پس جس طرح ہدایت کے مراتب بے انتہا ہیں جیسا کہ سوال نمبر ۹۰ میں لکھا جا چکا ہے اسی طرح ضلالت کے بھی بیشمار مراتب ہیں کیونکہ ہر ہدایت کے مقابلہ میں ایک ضلالت ہے! ور ہدایت کے مراتب حاصل ہو جائیں تو بھی جس طرح ہدایت کے مرتبے پھر باقی رہتے ہیں مثلاً ایک بڑے سے بڑے ہدایت یافتہ کو اس سے بڑے مرتبۂ کمال کی ہدایت نہو تو وہ اس کے حق میں ضلالت (گمراہی) قرار پاتی ہے اور اس مرتبے کے لحاظ سے وہ ضال (گمراہ) کہلا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (جو معصوم ہیں) انکے بارے میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ (اور اللہ تعالےٰ نے آپکو راہ بھولا ہوا پایا پس راہ دکھائی (پ ۳۰ ر ۱۸) کیونکہ اسوقت تک آپ مرتبۂ نبوت پر نہیں پہنچے تھے اسلئے ضال تھے پھر اللہ تعالےٰ نے ظاہری وحی کے ذریعہ ہدایت کر دی۔

سوال نمبر ۱۰۹۔ اسکی کیا وجہ ہے کہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (انعام کیا تو نے اُنپر) میں انعام کو اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کیا گیا اور مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ (جن پر اللہ تعالےٰ کا غصہ کیا گیا) میں غضب کی نسبت اللہ تعالےٰ کیطرف نہیں کی گئی اور ضَالِّينَ (راستہ بھٹکے ہوئے) گمراہی کی نسبت بھی بندوں کی طرف فرمائی گئی ہے حالانکہ جس طرح اللہ تعالےٰ بندوں کو انعام دینے والا ہے اسی طرح وہی غضب فرمانے والا اور گمراہ کرنے والا بھی ہے؟

جواب۔ اسکی کئی وجوہ ہیں منجملہ انکے ایک یہ ہے کہ انعام کی نسبت اللہ تعالےٰ اپنی طرف کر کے یہ بتلا دیا کہ انعام الٰہی بندوں کے بس کی چیز نہیں ہے۔
دوسرا یہ کہ انعام ایک ایسا احسان ہے جو کسی استحقاق کے بغیر کیا جاتا ہے بخلاف اسکے غضب برے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے اور سمجھ کی کمی گمراہی کا سبب بنتی ہے اسلئے مَغْضُوبِ (غضب کئے ہوئے) بندوں کو قرار دیا گیا کیونکہ بندے اپنے کرتوت سے غضب الٰہی کے جس طرح مستحق بنتے ہیں اسی طرح گمراہی میں بھی بندے مبتلا ہوتے ہیں اسلئے ضَالِّينَ (راستہ بھٹکے ہوئے) بھی بندوں کو قرار دیا گیا ہے۔
تیسرا یہ کہ اگرچہ انعام فرمانا جس طرح اللہ تعالےٰ کا کام ہے ویسا ہی غضب فرمانا اور گمراہ کرنا بھی اُسی کیطرف سے ہوتا ہے لیکن ذات باری تعالےٰ کے ساتھ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسکو اللہ تعالےٰ سے منسوب نہیں کیا گیا

سوال نمبر ۱۱۰ - صرف انعام الہی پائے ہوئے حضرات کی راہ پر چلانے کی دعا کافی تھی پھر اسکی کیا ضرورت تھی کہ غصہ کئے گئے ہوئے اور گمراہوں کے راستہ پر نہ چلانے کی بھی دعا کیجائے؟ **جواب** - چونکہ ایمان نام ہے امید و خوف کا - اللہ تعالے فرماتا ہے - نَبِّئْ عِبَادِيْ اَنِّيْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ○ (آپ میرے بندوں کو اطلاع دیدیجئے کہ میں بڑی مغفرت اور رحمت والا بھی ہوں اور یہ کہ میری سزا دردناک سزا ہے (پ ۱۴ ر ۴) چنانچہ قرآن مجید میں جہاں وعید بیان ہوئی ہے وہاں رحمت الہی کا ذکر کردیا گیا ہے اور جہاں جنت کا ذکر فرمایا جاتا ہے اسکے ساتھ ہی دوزخ کا بھی تذکرہ کردیا جاتا ہے تاکہ ہر دو کے ذکر سے بندے اعتدال کی راہ چل سکیں - اسی طرح اس سورہ میں بھی جہاں بطور امید انکے راستہ پر چلنے کی دعا سکھائی گئی ہے جن پر اللہ تعالے کا انعام ہوا ہے اس کی بھی ضرورت تھی کہ خوف کرتے ہوئے ایسوں کی راہ سے بچاؤ کی بھی دعا کیجائے جنکی پیروی غضب الہی میں مبتلا کردے یا گمراہوں میں شامل کردے اس لئے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (راستہ ان کا جن پر تونے انعام کیا) کے بعد ہی غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ (نہ انکا (راستہ) جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور نہ انکا جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں) کو بیان فرمایا گیا

سوال نمبر ۱۱۱ - اسکی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالے نے نہ تو صراط مستقیم پر چلنے والوں کی صراحت فرمائی نہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ جن پر (اللہ تعالے کا) غصہ کیا گیا) کی نہ ضالین (راستہ بھٹکے ہوئے) کی ہے؟ **جواب** - نصیحت کا یہ بھی ایک اصول ہے کہ کسی خاص شخص یا خاص جماعت کا نام لیکر مخاطب کرنا مناسب نہیں ہوتا جس کی وجہ ایک تو یہ ہوتی ہے کہ کسی فریق کا نام لینے سے ان فریقوں (۱) جو صراط مستقیم پر ہیں (۲) تفریط پسند (۳) افراط پسند) کے نتیجوں (یعنی اسکی صراحت کہ وہ مقبول الہی ہیں یا مردود بارگاہ) کا ذکر رہ جاتا تھا حالانکہ نتیجوں کا ذکر مقصود اصلی ہوتا ہے - دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کسی کا نام لیکر اسکو صراط مستقیم پر قائم کہا جاتا تو اس میں خود پسندی پیدا ہوتی اور جنکو اسکے خلاف کہا جاتا وہ ناراضگی ظاہر کرتے اور یہ سمجھتے کہ "ہم تو صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے اور ازلی گمراہ جب ہو چکے ہیں تو پھر ہدایت کی تلاش کی کیا ضرورت ہے تیسری وجہ یہ ہے کہ شارع علیہ السلام کے احکام ایسے ہونے چاہئیں جو اشخاص کے اور زمانوں کے بدلنے سے نہ بدلیں - اسلئے صرف یہ فرمادیا کہ صراط مستقیم ان کا طریقہ ہے جن پر اللہ تعالے کا انعام ہوا نہ انکا جن پر اللہ تعالے کا غصہ ہوا اور نہ انکا جو بے راہ ہوئے تاکہ یہ عام نصیحت تخصیص کے طور پر نہ ہونے کی وجہ سے دل پر بہت اثر کرے -

ضاد کا صحیح مخرج تو یہ ہے کہ زبان کا دل کنارہ اگلی داڑھوں سے لگائیں مگر بعض

لوگ اسکی پرواکئے بغیر ضَالِّیْن کو دَالِّیْن پڑھ دیتے ہیں جو صریحًا غلط ہے کیونکہ اس سے معنی بھی بالکل برعکس ہوجاتے ہیں وہ یہ کہ ضَالِّیْن کے معنی "راستہ بھٹکے ہوئے" کے ہیں اور جب بجائے اسکے دَالِّیْن (یعنی رہبری کرنے والے) کہدیں تو ایسی صورت میں یہ استدعا ہوجاتی ہے کہ "الٰہی مجھے رہبری کرنے والوں کا راستہ نہ چلا" جو بالکل غلط ہے اسلئے صحیح مخارج کا حتی الامکان ضرور خیال رکھنا چاہئے۔ البتہ علماء کے صحیح مذہب کے لحاظ سے ضاد اور ظا کے مخرج ادا کرنے میں تمیز نہ ہو تو یہ خلل معاف ہے مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ مخارج حروف کی ادائی سے بالکل بے پروا بن جائیں بلکہ صحیح کی ادائی کی کوشش ضرور کریں اسی طرح اکثر لوگ بعض الفاظ کے حروف کو پوری طرح ادا نہیں کرتے جیسے رَفَعْنَا کو رَفَعْنَ پڑھ دیتے ہیں اسلئے پڑھتے وقت اس قسم کے الف کو ظاہر کرنا ضروری ہے ورنہ "ہم نے بلند کیا" کے بجائے "ان سب عورتوں نے بلند کیا" کے معنی ہوجاتے ہیں جو بالکل غلط ہوتے ہیں اس لئے اسی طرح کے دیگر الفاظ کو بھی صحیح طور پر پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے مثلاً قُلْنَا کو قُلْنَ نہ پڑھیں وَضَعْنَا کو وَضَعْنَ نہ پڑھیں کیونکہ اس میں معنی بہت بدل جاتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کا اجمالی بیان

جیسا کہ سوال نمبر ۳۵ کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ اسکا نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کیلئے ہے تو اس میں صفات بھی دس بیان ہوئی ہیں جن میں نصف یعنی پانچ صفات ربوبیت ہیں اور پانچ صفات عبودیت جو ایک دوسرے کے مقابل بھی ہیں جیسے ذیل میں ظاہر کیا جاتا ہے:۔

صفات ربوبیت	صفات عبودیت
اللہ	عبادت
رب	استعانت (طلب مدد)
رحمٰن	طلب ہدایت
رحیم	طلب استقامت
مالک	باقی نعمتوں کا طلب کرنا اور غضب الٰہی سے پناہ۔

تفصیل اسکی یہ ہے کہ صفاتِ ربوبیت کے مقابل صفات عبودیت گویا بطور دعا کے بیان ہوئی ہیں وہ اسطرح کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریف اللہ تعالےٰ ہی کے واسطے ہے) کے مقابل میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) ہے کیونکہ انسان جونہی یہ معلوم کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہی سب خوبیوں کا جامع ہے تو وہ بے اختیار گویا کہہ اٹھتا ہے کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ پھر رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سب عالموں کا پالنے والا) کے مقابل میں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کو رکھا ہے کیونکہ جب انسان کو یقین ہوجائے کہ ہمارا خدا ہر ایک کا محسن ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اسی طرح اَلرَّحْمٰن کے مقابل میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (بتلا ہمکو راستہ سیدھا) کو بیان کیا

اسلئے کہ جب انسان دیکھتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کے کسی عمل کے بغیر اسکی تمام ضروریات کو پوری کیا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے رَحْمٰن (جس کے معنی ایسے دینے والے کے بھی ہیں جو محنت لئے بغیر دیتا ہے) میری سب سے بڑی ضرورت آپکی حضوری تک پہنچنا ہے جس کیلئے سامان پیدا کیجئے تاکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ پھر الرَّحِیْم (نہایت رحم والا) کے مقابلہ میں صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ (راستہ انکا جن پر تونے انعام کیا) کو لایا گیا کیونکہ رحیمیت یہ چاہتی ہے کہ کسی کام کو ضائع نہونے دیا جائے اسلئے بندہ گویا رحیم کہہ کر یہ عرض کر رہا ہے کہ سیدھے راستے پر چلاتے چلاتے مجھے ان انعامات کا وارث کر دیجئے۔ جو پہلے لوگوں کو ملے ہیں تاکہ سیدھے راستے پر میرا چلنا ضائع نہ ہو جائے۔ اس کے بعد مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (مالک ہے بدلہ کے دن کا) کے مقابل غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ (نہ انکا جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور نہ انکا جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں) کو رکھا ہے کیونکہ جب بندے کو یقین ہو کہ میرے اعمال کا حساب لیا جائیگا تو فوراً اس کے دل میں ناکامی کا خوف بھی پیدا ہو جاتا ہے پس بندہ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (مالک ہے بدلہ کے دن کا) پر غور کر کے اللہ تعالےٰ کی ناراضی سے بچنے کی دعا کرتا ہے اور اسکا فرمانبردار ہو جاتا ہے۔

مخفی نہ رہے کہ کسی ذات کی فرمانبرداری دو ہی وجہ سے ہوتی ہے (۱) محبت کی وجہ سے (۲) خوف کی وجہ سے۔ کیونکہ جن لوگوں کی طبیعت میں احسان کی قدر کا مادہ زیادہ ہوتا ہے تو وہ احسان کو دیکھ کر جذبہ محبت کی وجہ فرمانبرداری کرتے ہیں اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو احسانات کی پروا نہیں کرتے لیکن خوف انکو فرمانبرداری پر مجبور کر دیتا ہے۔ مگر دانائی کا تقاضہ یہ ہے کہ پہلے محبت سے کام لیا جائے اور جب اس سے کام نہ چلے تو پھر خوف دلائے۔ اسی سورۂ فاتحہ میں یہی اصول پایا جاتا ہے وہ اسطرح کہ اللہ تعالےٰ نے پہلے ان صفات کا بیان کیا ہے جن پر غور کرنے سے بندے کا دل محبت الٰہی سے بھر جاتا ہے یعنی اللّٰہ جو اس ذات کا نام ہے جو سب خوبیوں کا جامع اور تمام نقائص سے منزہ ہے۔ اور رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (سب عالموں کا پالنے والا) کی صفت یہ ظاہر کر رہی ہے کہ وہ رازق ہے مومن و کافر سب کی پرورش فرماتا ہے اس نے ہماری زیست کے وہ سامان جن سے ہم واقف بھی نہیں ہمارے لئے پیدا کئے۔ پھر بتلایا کہ ہم جو نیک عمل کرتے ہیں انکا بہتر سے بہتر انعام دینے والا وہی ہے پس جو لوگ احسان کو دیکھکر فرمانبرداری کرنے کے عادی ہیں وہ ان صفات پر غور کر کے بے اختیار اِیَّاكَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) کہکر اس کے آگے جھک جاتے ہیں لیکن جو لوگ محبت کے اثرات سے ناواقف ہوتے ہیں اور سخت سلوک کے عادی ہوتے ہیں انھیں خوف دلانے کیلئے آخر میں مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (مالک ہے بدلہ کے دن کا) کی صفت بیان فرمائی گئی

تاکہ جب اس صفت خداوندی پر غور کیا جائے تو بندے سمجھیں کہ ایک دن اسکے سامنے حاضر ہوکر اس کے سب انعامات کا حساب دینا ہوگا جس کے بعد بندے پر خوف الٰہی طاری ہوجاتا ہے تو وہ خوف کیوجہ بے اختیار ہوکر اللہ تعالیٰ کے آگے اپنی فرمانبرداری کا اقرار کرتے ہوئے گردن جھکا دیتا ہے۔

علاوہ ازیں جب بندہ انعام یافتہ جماعت (جو محبوب گروہ ہوتا ہے) میں شامل ہوکر اس روحانی لذت کو پاتا ہے تو اب اسکی یہ تمنا ہوتی ہے کہ یہ مقام اسکو ہمیشہ حاصل رہے۔ اسلئے خدا تعالیٰ سے جدا نہ ہونے کی التجا کے طور پر بندہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (نہ انکا جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور نہ انکا جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں) کہتا ہے کیونکہ جدائی کے دو طریقے ہوتے ہیں (۱) معشوق ناراض ہوکر نکال دے یا (۲) عاشق ہی عشق ترک کر کے علیحدہ ہو جائے تو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے یہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ الٰہی! میری کسی غلطی کیوجہ سے مجھ پر ناراض نہ ہو۔ اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہہ کر گویا عرض کر رہا ہے کہ خدایا! ایسا بھی نہ ہو کہ منزل مقصود تک پہنچکر میرے ہی دل میں تیرے سوا کسی اور سے عشق پیدا ہوجائے اور میں تجھے چھوڑ کر کسی اور کیطرف چلا جاؤں۔ الغرض یہ ایک ایسی کامل اور جامع دعا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رحم و کرم سے انسان کو تعلیم دی کہ اپنے حضور میں عرض کرے۔

تعلیم کی خوبی یہ ہے کہ پہلے ایکبار اجمالاً تعلیم دیدیجائے پھر تدریجاً تفصیل بیان کردی جائے کیونکہ اجمال کی بعد اسکی تفصیل دل نشین ہوتی ہے اور مختصر طور پر اسکو معلوم کرلینا زیادہ آسان بھی ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تمام الہامی مضامین کو اس سورۂ فاتحہ میں مجملاً جمع فرما دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی تقدیس اور اسکی صفات سے متعلق جتنی آیات ہیں اور آسمان و زمین و دیگر تمام مخلوقات کی ابتدائے آفرینش اور اسی طرح علامات قدرت اور دنیا کی نعمتوں کے بارے میں جسقدر آیات بیان کی گئیں ہیں وہ سب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (سب تعریف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا) کی تفصیل ہے۔ اور دنیا کی بے ثباتی انسان کی موت۔ عذاب و ثواب کی کیفیت احوال قیامت اور وہ آیات جن میں دیدار الٰہی کا ذکر ہے وہ سب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (مالک ہے بدلے کے دن کا) کی شرح ہے اور جتنی آیات نماز۔ روزہ حج۔ زکوٰۃ۔ صدقات اور اخلاص و اطاعت کے متعلق ہیں وہ سب اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) کی تفسیر ہیں۔ اسی طرح جو کچھ باہمی معاملات میں نیک چلنی لوگوں سے نیکی کے ساتھ پیش آنا گناہوں سے بچنے اور اخلاق حمیدہ پیدا کرنے اور ہر معاملہ میں درمیانی چال کی بات جہاں جہاں آیات میں آئی ہیں ان سب کا خلاصہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

(بتلا ہمکو راستہ سیدھا) میں ہے۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے اور انکے پیرو حضرات کے محامد اور اور انبیاء علیہم السلام اور ملائکہؑ پر ایمان لانیکے متعلق اور انکے طریقے جو مختلف سورتوں میں مذکور ہیں وہ سب صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (راستہ ان کا جن پر تونے انعام کیا) میں اجمالاً موجود ہیں۔ اور جسقدر سرکشوں کے قصے اور انپر عذاب کا نازل ہونا مذکور ہے اور گمراہوں نا فرمانوں کے عبرت انگیز انجام آگے قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں وہ سب غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ (نہ انکا جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور نہ انکا (راستہ چلا) جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں) کی تشریح و تفسیر ہیں۔

اور یہ کہ اکثر اوقات خواہشات نفسانی ہی استقامت سے لغزش کا سبب ہوتی ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں بموجب صراحت ذیل خواہشات نفسانی سے استقامت کیساتھ بچنے کیطرف اشارہ فرمایا ہے مثلاً حسد کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (سب تعریف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے) کہہ کر زائل کیا گیا اسلئے کہ یہ کلمہ ظاہر کرتا ہے کہ بندہ راضی اور خوش ہوا ہے اللہ تعالیٰ کے ان عطیوں پر جو تمام مخلوق پر کئے گئے ہیں اور حسد اس طرح کی خوشنودی کی ضد ہے۔ اور رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سب عالموں کا پالنے والا) کہنے سے بخل کا ازالہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے اس امر کا اقرار ثابت ہوتا ہے کہ ہر نعمت اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ ہے لہذا بندہ کسی چیز کا مالک نہیں تو پھر بخل یعنی اس چیز کو روکنا جس کا خود مالک نہیں کیسے درست ہو سکتا ہے۔ اور الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (بہت مہربان نہایت رحم والا) سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کو یاد دلا کر غضب کو دفع کیا کیونکہ جب رحمت کا مضمون بندے پر اثر کیا تو غضب کافور ہو جاتا ہے۔ اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (مالک ہے بدلہ کا دن کا) سے جلال اخروی کو نمایاں فرمایا گیا۔ اور خودپسندی کا ازالہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) سے کر دیا کیونکہ عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے بندہ جب جھکا تو خود پسندی رخصت ہوئی۔ اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) سے تکبر دفع ہوتا ہے۔ کفر و شرک کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (بتلا ہمکو سیدھا راستہ) سے رد کیا اسلئے کہ ہر معاملہ میں درمیانی پن کفر و شرک کے منافی ہے۔ پھر غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ (نہ انکا (راستہ) جن پر تیرا غصہ کیا گیا) سے کفر و شرک کے نتیجہ کی برائی سے ڈرایا گیا۔ اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ (اور نہ (انکا راستہ چلا) جو راستہ بھٹکے ہوئے ہیں) سے نا فرمانوں کا انجام بتلایا گیا۔

علاوہ ازیں بندہ جب مقام مناجات میں کھڑا ہو کر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے لیکر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک اللہ تعالیٰ کے کمالات و صفات کو بیان کیا اس سے اللہ تعالیٰ کیطرف شوق پیدا ہوا جس کیلئے سفر کرنے کے واسطے توشہ اور سواری کی ضرورت ہوئی تو اِيَّاكَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے

ہیں) کہہ کر عبادت کو اس سفر کا توشہ بنایا اور اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (تجھ سے ہم مدد چاہتے ہیں) کو سواری بنایا کیونکہ غیبی امداد کے بغیر عبادت کا فائدہ یعنی توشہ عبادت کا نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب توشہ اور سواری دونوں حاصل ہو گئے تو اب راستہ کے متعین کرنے کی نوبت آئی اسلئے کہا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (بتلا ہمکو راستہ سیدھا) جس کے بعد گویا سیدھی سڑک مل گئی لہذا پھر راستے کے رفیق طلب کرنا ضروری ہوا تاکہ انکی رفاقت کی وجہ سے راستے کی تمام مشکلات آسان ہو جائیں اسلئے اسکے بعد صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (راستہ انکا جن پر تو نے انعام کیا) لایا گیا۔ اور چونکہ راستہ کے رہزن اور تکلیف دینے اور راستوں کے مشابہ ہونے کی وجہ بھٹکانے والوں سے حفاظت بھی منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے اسلئے آخر میں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ (نہ انکا (راستہ) جن پر تیرا غصہ کیا گیا اور نہ ان کا (راستہ چلا جو) راستہ بھٹکے ہوئے ہیں) کہا۔

اٰمین

سورۂ فاتحہ کے ختم پر کسی قدر وقفہ کے بعد آمین کہنا چاہیئے۔

سوال نمبر ۱۱۲۔ آمین کس زبان کا لفظ ہے؟

جواب۔ یہ عربی نہیں بلکہ سریانی زبان کا لفظ ہے۔

سوال نمبر ۱۱۳۔ آمین کے تلفظ اور اس کے معنی کیا بتائے گئے ہیں؟ **جواب۔** آمین کو جو ممدود کہتے ہیں وہ اسکے الف ممدودہ کو معنی ندا کہتے ہیں یعنی "یَا اٰمِیْنُ اِسْتَجِبْ دُعَائِیْ" (اے آمین قبول فرما میری دعا) اور بد الف و قصر الف دونوں ہی طریقوں سے آمین کہنا جائز ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؒ و حضرت ہلال بن سیافؒ اور حضرت مجاہدؒ کا قول ہے کہ "آمین اللہ تعالے کا ایک نام ہے"۔ لہذا اے آمین کہنا چونکہ اے خدا کہنے کے مانند ہے اسلئے درست مانا جا سکتا ہے۔ اور اسکا تلفظ اَمِیْنُ بھی بتلایا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "آمین کے کیا معنی ہیں"؟ تو آپ نے فرمایا "اے اللہ تو کر"۔ بعضوں نے کہا کہ آمین کے معنی اسی طرح ہو" یا "ہماری امیدوں کو نہ توڑ" کے ہیں۔ اور بعضوں نے کہا کہ آمین کے معنی یہ ہیں کہ "اے اللہ تو ہماری دعا کو قبول فرما"۔

سوال نمبر ۱۱۴۔ آمین کے فضائل اور اسکے کہنے کے مواقع کیا ہیں؟ **جواب۔** حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ "آمین اللہ تعالے کی مہر ہے اپنے مومن بندوں پر" اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالے کی طرف سے مجھے آمین عطا ہوئی ہے کہ نماز میں اور دعا پر کہی جائے اور میرے پہلے (حضرت) موسیٰؑ کے سوا کسی نبی کو یہ نہیں دیگئی"۔ یہودیوں نے آمین کو جب توریت میں دیکھا تو فخر کرنے لگے کہ اللہ تعالے نے ہمکو ایسی چیز دی ہے جو مسلمانوں کو نہیں ملی۔ پس اللہ تعالے نے "آمین" اس امت محمدیہ کو بھی

باقی

عطا فرمایا اور اسکا اسقدر ثواب دیا کہ یہودیوں کو نہیں دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "یہودی آمین کیوجہ جسقدر تم پر حسد کرتے ہیں اسقدر حسد کسی اور امر پر نہیں کرتے۔ پس تم بھی آمین بکثرت کہا کرو" ارشاد نبوی ہے کہ "تم اپنی دعاؤں کو آمین پر ختم کیا کرو اللہ تعالےٰ اس سے تمہاری دعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔" اور فرمایا کہ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے بعد جو آمین کہتاہے اور وہ آسمان والوں کی آمین سے ملجاتی ہے تو اسکے تمام گزشتہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۱۵۔ دعا کرنے والے کے ساتھ آمین کہنا کس لئے بہتر ہے؟ **جواب۔** اسلئے بھی بہتر ہے کہ کسی دعا پر آمین کہنے والا خود وہ دعا کرنے والے کے جیسا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○ (اور موسیٰؑ نے (دعا میں) عرض کیا اے ہمارے رب (ہمکو یہ بات معلوم ہوگئی کہ) تونے فرعون کو اور اسکے سرداروں کو سامان تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں اے ہمارے رب اسی واسطے دئے ہیں کہ وہ تیری راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں۔ اے ہمارے رب انکے مالوں کو نیست و نابود کردے اور انکے دلوں کو (زیادہ) سخت کردے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہوجائیں) پس یہ ایمان نہ لانے پائیں یہاں تک کہ درد دینے والے عذاب (کے مستحق ہوکر اس) کو دیکھ لیں (پ ۱۱ ر ۱۴) سے اسکا ثبوت ملتا ہے۔ وہ اسطرح کہ اللہ تعالےٰ نے اسکے بعد یہ نہیں فرمایا کہ "اے موسیٰ تمہاری دعا ہم نے قبول کی" بلکہ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا یعنی تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی (پ ۱۱ ر ۱۴) کیونکہ حضرت موسیٰؑ کی دعا پر حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے اسلئے دَعْوَتُكُمَا (تم دونوں کی دعا) تثنیہ کا صیغہ ہے لاکے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کہی ہوئی دعا کو حضرت ہارون علیہ السلام کی بھی دعا قرار دیکر اللہ تعالےٰ نے یہ بتلادیا کہ آمین کہنے والا بھی دعا کرنے والے کے جیسا ہی ہوتا ہے۔ الغرض آمین کہنے سے کئی فائدے ہیں ایک تو یہ کہ دعا کرنے والے کی تائید ہوتی ہے دوسرا یہ کہ خود بھی دعا کرنے والا بنتا ہے تیسرا یہ کہ آمین کہنا دعا قبول ہونے کا باعث ہوتا ہے چوتھا یہ کہ سابقہ گناہ بھی اس سے معاف ہوتے ہیں جبکہ فرشتوں کی آمین کے ساتھ موافقت ہوجائے اور موافقت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی آمین کہنے اور فرشتوں کی آمین کہنے کا وقت ایک ہوجائے۔ یا موافقت سے مراد قبولیت میں موافقت ہونا ہے یا یہ مراد ہے کہ فرشتے کی طرح یہ آمین کہنے والا بھی اخلاص میں برابر ہو۔ پس آمین کہنا دعا کے اثر کو اور اسکے تمام و کمال پھل کو لاتا ہے۔

مسائل

سوال نمبر ۱۱۶ - آمین قرآن مجید کا جزو ہے یا کیا - علاوہ ازیں آمین کہنے سے متعلق ائمہ کرام کا کیا اختلاف ہے؟

جواب - حضرت مجاہدؒ آمین کو سورۂ فاتحہ کا جزو اور داخل قرآن سمجھتے ہیں اور انکے نزدیک سورۂ فاتحہ کی ابتدا ثنا (تعریف) سے ہے اور درمیان اسکا دعا ہے اور آمین کہہ کر دعا کی قبولیت طلب کرنا سورۂ فاتحہ کا اختتام ہے۔ مگر دیگر علماء کے نزدیک آمین قرآن مجید کا جزو نہیں ہے چنانچہ سورۂ فاتحہ کا آغاز (استعاذہ کیلئے) اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ سے ہوتا ہے جو غیر قرآن ہے اور اس سورہ کا اختتام بھی غیر قرآن لفظ آمین پر ہوتا ہے جو اسلئے کہا جاتا ہے کہ دعا مقبول ہو جسطرح کہ عام دعاؤں کے بعد بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

سورۂ فاتحہ کے ختم پر آمین کہنا سنت ہے مگر اسکے آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ اور دیگر اکابر علماء آمین کو آہستہ آواز سے کہنا اولیٰ سمجھتے ہیں اسلئے کہ پہلی دلیل اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تذلل ظاہر کر کے بھی اور چپکے چپکے بھی (البتہ یہ بات) واقعی (ہے کہ) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو (دعا میں) حد (ادب) سے نکل جائیں (پ ۸ ع ۱۴) تو معلوم ہوا کہ آہستہ آواز کے ساتھ دعا کرنی چاہئے اسلئے کہ تضرع اور زاری آہستگی میں خوب پائی جاتی ہے جو دعا میں اصل الاصول ہے اور آمین بھی دعا ہے جیسا کہ عطاؒ نے بھی فرمایا ہے دوسری دلیل صحیحین کی حدیث میں مذکور ہے کہ امام جب وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو جس سے معلوم ہوا کہ آمین آہستہ کہنا چاہئے نہ کہ پکار کے کیونکہ اگر امام پکار کر آمین کہتا تو مقتدیوں کو خود معلوم ہو جاتا پھر حدیث میں سورۂ فاتحہ کی آخری آیتہ کا پتہ بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ اور جب پتہ بتایا گیا ہے تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ آمین آہستہ کہی جاتی ہے تیسری دلیل حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو سکتے کرتے تھے (۱) تکبیر تحریمہ کے بعد (اس سکتہ میں تعوذ اور ثنا پڑھتے تھے) (۲) جبکہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھ چکتے (اس سکتہ یعنی وقفہ خاموشی میں آمین کہتے) اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آمین پکار کر کہتے تو اس صحیح حدیث میں سورۂ فاتحہ کے ختم پر چپ رہنے کا ذکر نہیں ہوتا۔

حضرت امام شافعیؒ و حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر علمائے کرام فرماتے ہیں کہ آمین ذرا آواز سے کہیں تو بہتر ہے کیونکہ حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ "میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھنے کے بعد با آواز بلند آمین کہتے سنا"۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ "آمین سے مسجد گونج جاتی تھی" تو احناف کی طرف سے اسکا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ

پہلے تو آیۃ قرآنی کے استدلال کو حدیث سے توڑا نہیں جا سکتا۔ دوسرا یہ کہ آمین کو آہستہ کہنے کے متعلق ایسی حدیثیں ہیں جن میں کسی کو کلام نہیں بخلاف اسکے آمین بالجہر سے متعلقہ ان حدیثوں میں محدثین کو کلام ہے اسلئے حضرت امام بخاریؒ نے اگرچہ جہر آمین کا باب باندھا ہے مگر ان احادیث سے کسی کو درج نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو ان احادیث پر وثوق نہ تھا اسلئے قُوْلُوْا آمِیْن (آمین کہو) والی حدیث روایت کرنے پر اکتفا کیا۔ اور قُوْلُوْا آمِیْن (آمین کہو) میں قُوْلُوْا (کہو) کے حکم سے باآواز بلند آمین کہنا اسلئے ثابت نہیں ہوتا کہ قُوْلُوْا اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ (التحیات للہ کہو) قُوْلُوْا رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ (ربنا لک الحمد کہو) میں یہی لفظ قُوْلُوْا (کہو) ہونے کے باوجود کوئی عالم اسکا قائل نہیں کہ اَلتَّحِیَّاتُ بلند آواز سے پڑھی جائے یا رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ باآواز بلند کہتے رہیں۔

اگر تھوڑی دیر کیلئے آمین کو باآواز بلند کہنے سے متعلقہ احادیث کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو جس طرح ظہر و عصر میں (قرأت سِرّی ہونے کے باوجود) حسب روایت صحیحین کبھی کبھی کسی آیۃ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باآواز بلند پڑھ دیتے تھے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ان نمازوں میں قرآن پڑھ رہے ہیں اور یہ فلاں فلاں سورۃ پڑھی جاتی ہے اسی طرح تعلیم دینے کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کو بھی کبھی بلند آواز سے کہدیا ہوگا تاکہ آمین کہنا دوسرے لوگوں کو معلوم ہو جائے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کو دواماً بلند آواز سے نہیں کہا ہے اگر فی الواقع آپ ہمیشہ دمِ آخر تک آمین پکار کر فرماتے تو فیصل اس قسم کا تو نہ تھا جس کا انکار حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی فرما دیتے۔ لہذا ہوا یہ ہے کہ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی موقع پر بالجہر آمین بولتے سن لیا تو انہوں نے ہمیشہ باآواز بلند آمین کہنا اولیٰ سمجھ لیا۔ پس دلائل مندرجہ بالا سے ثابت ہوا کہ ہمیشہ آمین آہستہ کہنا چاہئے اور امام کے متعلق حضرت حسن کہتے ہیں کہ وہ چونکہ دعا کرنے والا ہے اسلئے اسے آمین نہ کہنا چاہئے اور یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے مگر امام اعظمؒ کی مشہور روایت یہ ہے کہ امام بھی آہستہ آمین کہے

نوٹ:۔ اس قسم کے دلائل ائمہ از دیاد معلومات کی غرض سے بیان کئے جاتے ہیں نہ اسلئے کہ کوئی صاحب اسکو یا اس جیسے فروعی مسائل کو نزاع کا باعث بنائیں پس ہر ایک کو چاہئے کہ سب کا احترام کرے۔

سوال نمبر ۱۱۱۔ کیا نماز میں امام کے پیچھے مقتدی بھی سورۂ فاتحہ پڑھے یا صرف امام کا پڑھنا سب مقتدیوں کی طرف سے کافی ہوتا ہے؟ **جواب**۔ یہ مسئلہ تو سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے لیکن امام کے پیچھے مقتدی سے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے متعلق ائمہ کرام کا اختلاف ہے جسے معہ دلائل ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:۔

حضرت ابو حنیفہؒ اور آپکے شاگردوں نیز صحابہؓ کبارؓ اور بڑے بڑے محدثین و تابعین کا یہ مذہب ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی سورۂ فاتحہ نہ پڑھے بلکہ چپ رہ کر امام کی قرأت کو سُنے اور ختم کرنے کے وقت آمین کہہ کر سب مقتدی اپنی شرکت ثابت کر دیں۔ کیونکہ (۱) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اسکی طرف کان لگایا کرو اور خاموش رہا کرو امید ہے کہ تم پر رحمت ہو (پ ۹ ر ۱۴) اسلئے امام کے پیچھے مقتدیوں کو خاموش رہ کر سورۂ فاتحہ سننا چاہئے۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیۃ چونکہ خطبہ[1] کے بارے میں نازل ہوئی ہے اسلئے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے سے متعلق اسکو بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جس کے دیگر جوابات کے منجملہ ایک جواب ان کا قول مانتے ہوئے یہ دیا گیا ہے کہ "خطبہ کے وقت جس کے اندر صرف قرآن مجید نہیں پڑھا جاتا بلکہ اس کے علاوہ اکثر اس میں نصیحت وغیرہ بھی ہوتی ہے جس کے باوجود جب چپ رہنا ضروری قرار دیا گیا تو ایسے وقت بدرجۂ اولیٰ خاموشی لازم ہونا چاہئے جبکہ صرف قرآن مجید پڑھا جائے اور وہ بھی نماز میں جس کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توجہ نہایت ضروری ہے۔ اور یہ مسلم ہے کہ خاموش رہنے سے جو توجہ پیدا ہوتی ہے وہ کہتے رہنے کی حالت میں پیدا نہیں ہوتی۔ (۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امام صرف اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ لوگ نماز میں اس کی اقتدا کریں پس چاہئے کہ جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور جب وہ قرآن پڑھے تو چپ ہو کر سنو (۳) آپ ہی سے دوسری روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب امام پڑھے تو خاموش رہو (۴) حضرت جابرؓ سے

---

[1] خطبہ کے بارے میں اس آیۃ کے نازل ہونے کا قول اس لئے صحیح نہیں کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی اور جمعہ مدینہ میں فرض ہوا۔ علاوہ ازیں اس آیۃ کے شان نزول میں مفسرین کے کئی قول ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ پہلے لوگ نماز میں باتیں کیا کرتے تھے تو اس آیۃ سے یہ حکم دیا گیا کہ امام کی قرأت سنو اور چپکے رہو۔ ایک گروہ کہتا ہے جب دوزخ و جنت کا حال کسی آیۃ میں سنتے تو لوگوں کی چیخیں نکل جایا کرتیں جس پر یہ آیۃ نازل ہوئی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس آیۃ سے امام کے پیچھے پڑھنے کو مطلق منع کیا گیا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ امام کے پیچھے ہم زور سے پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بار گزرا اور سلام پھیر کر آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ "کیا تم امام کے پیچھے پڑھا کرتے ہو؟" صحابہؓ نے عرض کیا "جی ہاں" تو آپ نے فرمایا کہ "تم اتنا نہیں سمجھتے کہ جب قرآن پڑھا جایا کرے تو چپکے ہو کر سنا کرو۔" ۱۲

مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے[1]۔

مگر امام شافعیؒ کے نزدیک مقتدی کا سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے اس لئے حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ "ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیچھے قرآن پڑھا کرتے تھے ایک روز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قرأت بھاری گزری۔ تو آپ نے فرمایا کہ "تم میرے پیچھے قرآن پڑھتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ "ہاں" آپ نے فرمایا کہ سوائے ام القرآن (سورۂ فاتحہ) کے اور کچھ نہ پڑھا کرو"۔ اور ظاہر یہ کہ علاوہ حضرت امام شافعیؒ کا قول بھی ہے کہ احادیث میں امام کے ساتھ پڑھنے کی چونکہ ممانعت بھی آئی ہے اس لئے مقتدی کو چاہئے کہ سورہ فاتحہ ایسے وقت پڑھ لے جبکہ امام دم لیتا ہے خصوصاً تین سکتوں (وقفوں) میں۔ کیونکہ ابوہریرہؓ سے جب پوچھا گیا کہ "امام کے پیچھے بھی کیا سورۂ فاتحہ پڑھیں؟ تو آپ نے جواب دیا کہ "اپنے دل میں پڑھ لے"۔

لیکن احناف اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ "یہی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے (جو پہلے لکھی گئی ہے) کہ جب امام پڑھے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ چپ ہوکر سنو"۔ تو اس میں مطلقاً چپ رہنا ہے خواہ سورۂ فاتحہ ہو یا اور کوئی قرآنی آیت۔ لہذا حضرت ابوہریرہؓ سے یہ توقع ہرگز نہیں ہو سکتی کہ جس حدیث کے خود راوی ہیں اسی کے خلاف فتویٰ دیں بلکہ آپ کے قول "اپنے دل میں پڑھ لے" سے مراد یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے مضمون کو اپنے دل میں تصور کرلیں نہ کہ زبان سے پڑھیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک اور روایت ہے کہ ایک جہری نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (نماز سے فارغ ہوکے صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوکر) پوچھا کہ "تم میں سے کسی نے میرے ساتھ کچھ پڑھا ہے"؟ ایک صحابی نے عرض کیا "ہاں" تو آپ نے فرمایا کہ "میں بھی کہتا تھا کہ مجھ سے قرآن پڑھنے میں کون جھگڑا کر رہا ہے"۔ پس صحابہؓ نے یہ سنا تو ان نمازوں کے اندر جن میں پکار کر قرآن پڑھا جاتا ہے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے سے رک گئے۔

چنانچہ امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ وغیرہما فرماتے ہیں کہ مقتدی جہری نمازوں جیسے فجر، مغرب اور عشا وغیرہ میں تو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اور جن نمازوں میں امام قرآن آواز سے نہیں پڑھتا شلاً ظہر، عصر میں تو مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لے

---

[1] یہ تو علمی دلائل ہیں مگر اس کے علاوہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے جو مسکت جواب اسی مسئلہ پر اعتراض کرنے والے ایک بے پناہ ہجوم کو دیا تھا وہ یہاں بخوف طوالت نہیں لکھا گیا شائقین کرام وہ دلچسپ جواب میری کتاب "علم افزا" جلد اول کے سوال نمبر ۱۰۲ میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں (از مؤلف)۔

کیونکہ ان میں امام سے جھگڑا نہیں پایا جاتا - اور سورۂ فاتحہ پڑھنے کی فضیلت بھی حاصل ہو جاتی ہے اور خالی کھڑے رہنے سے فائدہ بھی کیا ہے"

مگر جو دلائل امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے سے منع کرتے ہیں وہ عام ہیں اور ان میں سری اور جہری نماز کی کوئی قید نہیں ہے - رہا سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کا ثواب خاموش رہنے کی صورت میں بھی مقتدی کو اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے جیسا کہ مندرجہ بالا حدیث میں بیان ہوا -

پس مقتدی خاموش بھی رہے تو اس کا شمار ازروئے حدیث چونکہ پڑھنے والوں میں ہوتا ہے اسلئے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنا چاہیے -

نوٹ - الحمد للہ کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر تمام ہوئی - سلسلہ کے لئے پارۂ اول (سورۂ بقرہ) کی تفسیر جلد دوم میں ملاحظہ فرمائیے -

نعتِ شریف

از

حضرت علامہ محمد حسام الدین صاحب فاضل رحمۃ اللہ علیہ

ہے کلام حق حقیقت میں، بیانِ مصطفےٰ
ہے زبان اللہ کی گویا زبانِ مصطفےٰ

روز دربارِ مقدس میں ہے ان کا ذکرِ خیر
کیوں نہ ہو ممدوحِ عالم مدح خوانِ مصطفےٰ

مسکن انوارِ حق ہے، معدن اسرارِ حق
ہو نہ رشکِ لامکاں کیونکر مکانِ مصطفےٰ

جذبۂ دل لے چلا ہے مجھ کو طیبہ کی طرف
دردا ُٹھ اُٹھ کر بتاتا ہے نشانِ مصطفےٰ

داغ ہیں عشقِ نبیؐ کے گلشنِ ایماں کے پھول
باغ ہے سینہ مرا، دل باغبانِ مصطفےٰ

لن ترانی ہے کہیں، دیدار کی دعوت کہیں
حضرتِ موسیٰؑ سے پوچھو عز و شانِ مصطفےٰ

کیا مزے، کس لطف کی دعوت شبِ معراج تھی
مصطفےٰ مہمانِ حق، حق میزبانِ مصطفےٰ

ہاتھ میں ہوں دو جہاں ہو زیر پا ہفت آسماں
سر کے نیچے ہو جو سنگِ آستانِ مصطفےٰ

تا بلندی اور پستی کو سکوں حاصل رہے
جسم تربت میں، قرینِ حق ہے جانِ مصطفےٰ

چاہنے والوں کو حضرتؐ کے خدا کرتا ہے پیار
کیا ہی خوش قسمت ہیں فاضل عاشقانِ مصطفےٰ

غلط نامہ

نوٹ:۔ ناظرین کرام اس غلط نامہ کی بنا پر پہلے کتاب کو صحیح فرمالیں تاکہ پڑھتے وقت تردد نہ پیدا ہو۔ (از مؤلف)

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۱۰	شھدَ اکم	شُھَدَاءَکُمْ
۴	۲	۱	حرف ایسے	حرف یا ایسے
۵	۱	۶	مداوت	عداوت
۶	۱	۸	لا الٰہ	لَا اِلٰہَ
۶	۲	۷	سلام	سلام و قدوس
۶	۲	۱۲	دادی	دوری
۷	۲	۷	علالت	علامت
۷	۲	۱۸	بیتے ہیں	لیتے ہی
۸	۲	۷	ان کا	یہ نام
۸	۲	۱۴	جر	جو
۱۲	حاشیہ	۱۲	میں عفور	میں یعنی غفور
۱۲	۲	۹	ہی	بھی
۱۳	۲	۴	نعوذ	تعوذ یعنی
۱۶	درمیان میں	۷	مَالِکِ	مُلْکِ
۱۸	۱	۲	غرض حضرت	غرض سے حضرت
۱۸	۱	۴	صورتوں	سورتوں
۱۸	۲	۲	معاملہ صحابہ	معاملہ میں صحابہ
۱۹	۱	۲۵	شکر ہے	شکر کی بنیاد ہے
۲۱	۲	۴	راست	راستہ
۲۳	۲	۱۱	ف ۔ اور	ف ۔ نہیں ہیں اور
۳۰	۱	۹	سمجھا جاتا ہے	سمجھا جا سکتا ہے
۳۴	۱	۸	بھی منجملہ دیگر	بھی دیگر
۳۴	۱	۹	کے ایک	کے منجملہ ایک
۳۷	۲	۲۱	دسریہ	دہریہ
۳۷	حاشیہ	۱	حاشیہ صہ ۱۴	حاشیہ صفحہ دیگر
۳۸	۲	۱۴	بندے بلاواسطہ	بندے کو بلاواسطہ
۳۸	حاشیہ	۱	حاشیہ صہ ۱۳	حاشیہ صفحہ ماقبل
۴۰	۱	۵	اور مرغوب	ان مرغوب
۴۶	۱	۸	ہے اللہ تعالیٰ	ہے کہ اللہ تعالیٰ
۴۶	۱	۱۷	مالک کرتا	مالک ہوا کرتا
۴۷	۲	۱۵	صلب	سلب
۴۸	۱	۱۸	انطقنا الذی	انطقنا اللہ الذی
۵۰	۱	۲۵	لرنا	کرتا
۵۱	۲	۱۳	تجھ سے کرتے	تجھ سے
۵۱	۲	۱۴	عبادت	عبادت کرتے
۵۳	۱	۵	لحمدُ	اَلْحَمْدُ
۵۴	حاشیہ	۷	زلیخا کے	زلیخا نے
۵۶	۱	۱	اسلی	اسکی
۶۵	۲	۱۳	ہو	رہو
۶۷	۲	۲۳	نے اپنی	اپنی
۷۲	۱	۵	مالک روایت	مالک سے روایت
۷۴	۲	۲	معلوم ہو کہ	معلوم ہوا کہ
۸۱	۲	۲۲	(لمی)	(کمی)
۸۲	۱	۲۲	قرآن مجید میں	ارشاد باری
۸۲	۲	۲۲	استدلالی	استدلال
۸۴	۲	۲۳	یہ کہنا	×

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۸۴	۲	۲۴	کرم کیسے	کرم کہنا کیسے	۹۳	۲	۹	مندرین	مُنذِرِینَ
۸۵	۲	۹	شانچہ	چنانچہ	۹۳	۲	۲۵	کدا	کا
۸۶	۱	۱۸	بروقت	ہر وقت	۹۴	۲	۱۴	اُدَمَ	اُدمُ
۸۶	۱	۲۵	ملم	علم	۹۶	۱	۱۵	ہماری	ہمراہی
۸۷	۱	۲۱	دلالے	دلانے	۹۶	۱	۲۱	پیغمبر	ہر پیغمبر
۸۷	۲	۸	نگیرد	نگرید	۹۶	۱	۲۴	کہنے	کہنا
۸۸	۱	۲	تضرعً	تضرعاً	۹۷	۱	۱	نوعیت	نوعیت
۸۸	۱	۸	لر	نگر	۹۷	۲	۱	منابت	مناسبت
۸۸	۱	۱۴	رابوں	راہبوں	۹۷	۲	۱۲	حس	جس
۸۸	۱	۱۷	صِرَطُ	صِرَاطُ	۹۸	۱	۵	انعام کی انعام کی	انعام کی
۸۸	۲	۱۱	مطب	مطلب	۹۹	۱	۱۰	انکا	انکا
۸۹	۱	۱۰	بنت	جنت	۱۰۰	۲	۹	ہیں سخت	ہیں اور سخت
۸۹	۱	۱۴	توانانیاں	توانائیاں	۱۰۱	۱	۲۰	اسلئے یہود	اسلئے پہلے یہود
۸۹	۱	۱۶	اس کی	اسکی	۱۰۱	۱	۲۵	نام	تمام
۹۰	۲	۲۵	ذابِ	ذاتِ	۱۰۲	۱	۱۴	رہر	ہر
۹۱	۲	۲	صدا	صدہا	۱۰۲	۱	۱۵	جس طرح	×
۹۲	۱	۲	منمتح	متمتع					
۹۲	۱	۱۹	مراد	مراد					
۹۲	۱	۲۳	اوللیٹ	اُولٰئِک					
۹۲	۲	۴	جوا	ہوا					
۹۲	۲	۴	نبیوں	نبیوں					
۹۲	۲	۵	صدیقوں	صدیقوں					
۹۲	۲	۱۷	بدے	بندے					
۹۳	۲	۸	د	جو					

حضرت علامہ محمد حسام الدین فاضل رحمۃ اللہ علیہ کی

دیگر تصانیف

تذکرہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے واقعات نہایت پراثر انداز میں مستند کتب کے حوالہ سے بیان فرمائے گئے ہیں۔ ہدیہ ۱۲ر

تذکرہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ۹ر		جس میں خلفائے راشدین
" عمر فاروق رضی اللہ عنہ ۸ر		امامین ہمامین اور ہردو
" عثمان غنی رضی اللہ عنہ ۶ر		امہات المومنین رضی اللہ
" علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ۶ر		تعالےٰ عنہم کے حالات زندگی
" حسن رضی اللہ عنہ ۵ر		فضائل و اخلاق اسلامی خدمات
" حسین رضی اللہ عنہ ۸ر		واقعات و فتاوی شہادت مخالفین
" خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ۵ر		کے اعتراضات اور اسکے جوابات
" عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ۱۳ر		مدلل نہایت پراثر انداز میں مستند کتابوں کے حوالوں سے بیان کئے گئے ہیں

سعادت دارین — فقہی و اخلاقی مسائل کا بیش بہا خزینہ۔ عہ ۱۲

تفسیر فاضل جلد اول عہ ۱۲ — جلد دوم ۷ر — تین جزو ۶ر — قرآن مجید کی مفصل و جامع تفسیر نہایت شرح و بسط کے ساتھ بحوالہ کتب بیان کی گئی ہے۔

(تفسیر تسمیہ و تعوذ و سورہ فاتحہ)

دیوان فاضل نعتیہ (۵) روپے — نعت شریف و مناقب بزرگان دین کا بیش بہا گنجینہ عرفانیات کا لاثانی مجموعہ۔

فلسفہ حجاب ۷ر — وہ لاجواب مسدس جس میں پردہ کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔

جذبات فاضل

چھے حصے۔ فی ۲ر

وہ لاجواب مسدسات جس میں

(۱) قرض و مسکرات (۲) زنا کاری و امرد پرستی (۳) چاؤخانہ و تضیع اوقات (۴) سینما کی تباہ کاری (۵) جھوٹے ملاؤں کے مکروفریب اور (۶) شادی اور غمی میں انسان کی یاد الٰہی اور غفلت کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔

محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ تعلیمی اداروں اور تاجروں کو ۲۵٪ کمیشن

ملنے کا پتہ

حسامیہ منزل محلہ پنجہ شاہ

حیدرآباد ۔ ۲

مصنف کی دیگر تصانیف

کتاب التفسیر المعروف بہ تفسیر جلالی جلد اول

جس میں سورہ فاتحہ کی نہایت جامع ومانع تفسیر اسرار و نکات مسائل و لغات تفصیل کے ساتھ عام فہم انداز میں بالکل جدید طرز سے سوالاً جواباً اسطرح بیان کئے گئے ہیں کہ ہر شخص بآسانی علوم قرآنی سے واقف ہوجاتا ہے رنگین ٹائیٹل نہایت دیدہ زیب جس پر ابتدائی وحی کا مقام بتلایا گیا ہے۔ ہدیہ صرف دو روپیہ۔

لغز نغز المعروف بہ علم افزاء

جو سوالاً جواباً دلچسپ عام معلومات کا مع حوالہ کتب بیش بہا خزانہ ہے ہر مذاق کے لوگ اس سے مستفید ہوسکتے ہیں ٹائیٹل پر بھی ایک دلچسپ اور حیران کرنے والا نقشہ مختلف رنگوں سے مزین اور دیدہ زیب کتابت و طباعت عمدہ کاغذ چکنا اعلیٰ۔ ہدیہ صرف دو روپیہ۔

زیر طبع کتب:۔

اثبات تقدیر

جس میں تقدیر کے معرکتہ الآراء مسئلہ پر نہایت عالمانہ اور تشفی بخش بحث کیگئی ہے یقین ہے اس کے پڑھنے کے بعد تقدیر کے بارے میں کسی قسم کی الجھن محسوس نہ کیجائیگی۔

آیات کا شان نزول

جس میں آیات قرآنی کے شان نزول جمع کئے گئے ہیں۔

اطباء کا کارنامۂ جراحی

وہ لاجواب و بلند پایہ تصنیف جس میں اطبائے یونانی کے حیرت انگیز جراحی کارناموں کو پانچسو سے زائد تشریحی تصاویر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ حسامیہ منزل پنجہ شاہ حیدرآباد دکن ۲

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد دکن